کی محمدؐ سے وفا تو نے
تو ہم تیرے ہیں

اقبالؒ کے اشعار قرآنی آیات کی روشنی میں



باسمہٖ تعالیٰ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

اقبالؔ کی نظم "جوابِ شکوہ" اور ان کی دیگر نظمیں

قرآن کی روشنی میں

محمد بدیع الزماں

(ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ)

نام کتاب ________ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

مؤلف ________ محمد بدیع الزماں

دوسرا ایڈیشن ________ ۱۹۹۵ء

قیمت ________ 60/-

مطبع ________ نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد

ناشر

دانش بکڈپو۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یو۔پی)

22419

انتساب

اقبالؔ کے اس شعر کے نام

مِری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

("بالِ جبریل" ۔غزل ۲۸)

فہرست

حرفِ آخر ۔۔۔۔۔۔ ۵

کچھ اپنی باتیں ۔۔۔۔۔۔ ۷

"خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے" ۔۔۔۔۔۔ ۱۱

نظم "جوابِ شکوہ" (قرآن کی روشنی میں) ۔۔۔۔۔۔ ۲۰

"اقبالؔ اور تفضیلِ علیؓ" ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۰

"شبانی سے کلیمی دو قدم ہے" ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۴

"کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں" ۔۔۔۔۔۔ ۱۳۲

نظم "الارض للہ" (قرآن کی روشنی میں) ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۷

"قُلِ العَفو" (اقبالؔ کی نظم "صدیقؓ" قرآن اور حدیث کی روشنیوں میں) ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۲

"علمِ خاص اور اللہ کی مصلحتیں" ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۱

"اقبالؔ کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات" ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۸

"اقبالؔ کے چند اشعار قرآن کی روشنی میں" ۔۔۔۔۔۔ ۲۳۷

"اقبالؔ کے چند پند و نصائح" ۔۔۔۔۔۔ ۲۶۷

ضمیمہ نمبر ۱ ۔ حلِ لغات ۔۔۔۔۔۔ ۲۷۰

ضمیمہ نمبر ۲ ۔ "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" ۔۔۔۔۔۔ ۲۸۷

حرفِ آخر

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمّت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

("بالِ جبریل" — غزل ۱)

باسمہ تعالیٰ

کچھ اپنی باتیں

اقبالؔ پر میری یہ چوتھی کتاب ہے جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ پہلی کتاب تو "پیام اقبال" ہے جو صرف تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے اور جو بہار اُردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی اور جس کا پیش لفظ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۸۸ء میں مغربی بنگال اُردو اکاڈمی سے انعام پانے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ ملک کے بیشتر شہروں (خصوصاً دہلی) میں اس کی مقبولیت کے علاوہ حکومت بہار و بنگال اور کرناٹک اُردو اکاڈمی نے اِس کتاب کی کافی جلدیں خرید کر اپنے اپنے صوبوں کی لائبریریوں میں تقسیم بھی کیا ہے۔ یہ کتاب نتیجہ ہے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۵ء تک میرے مطالعۂ اقبالؔ کا۔

۱۹۶۸ء میری زندگی کا نہ معلوم کیوں ایک تاریخی سال بن گیا۔ میری مادری زبان اُردو ضرور ہے مگر ۱۹۶۸ء کے قبل اقبالؔ کی بات تو دور کی رہی اُردو ادب کے کسی بھی صنف سے مجھے کسی طرح کی دلچسپی نہ تھی مگر اسی سال نہ معلوم کیوں، جیسا میں نے "پیام اقبال" کے دیباچہ میں لکھا ہے، کسی کے اِس جملے نے کہ "اقبال بہت کچھ کر سکتے تھے مگر اُردو شاعری تشنہ کام رہی" مجھے اقبالؔ کے مطالعہ کی طرف رجوع کیا۔ جو "پیام اقبال" کی شکل میں سامنے آیا مگر یہ روایتی طور پر صرف تنقیدی مضامین تک ہی محدود رہا۔

اب اسے بھی اتفاق ہی کہئے کہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک میں پھر اُردو ادب کی دُنیا سے بالکل ہی بے تعلق ہو گیا۔ شاید میری ملازمت کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں نے مجھے اِس سے دور رکھا کیونکہ سرکاری ملازمت تو نہ معلوم کتنی طرح کی ہوتی ہے مگر اقبالؔ کا درج ذیل مصرعہ اگر صادق آتا ہے تو صرف اسی ملازمت پر کہ ؎

کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟

ادھر چند دہائیوں سے ملک کے تیزی سے بدلتی ہوئی حالات کے ردِ عمل کے طور پر جس ملازمت کی صبح لاٹھی چارج، دفعہ ۱۴۴، فائرنگ، مشین گن، اور آنسو گیس کے دھماکوں سے شروع ہوتی ہو اس میں ادب کیا کسی بھی فنِ لطیف کے گزر ہونے کی نہ گنجائش ہے نہ امکان۔ شاید ان نو برسوں میں میرے لئے قلم نہ اُٹھانا انہی وجوہ کی بنا پر رہا ہو۔

۱۹۸۰ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس بے تعلقی کا اثر ۱۹۸۳ء تک مکمل طور پر مجھ پر طاری رہا۔ مگر جس طرح ۱۹۶۸ء میری زندگی میں ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے اُسی طرح ۱۹۸۴ء کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ اِسی سال میں پھر غیر شعوری طور پر اقبالؔ کے مطالعہ کی طرف رجوع ہوا۔ مگر اب تنقید سے تفسیر پر چلا آیا۔ اور اقبالؔ کے کلام میں "شانِ خلیلؑ" کی تلاش شروع کر دی۔ اِس تلاش کے نتیجے کے طور پر پچھلے پانچ برسوں میں ملک کے اکثر و بیشتر رسائل و جرائد میں ایسے ہی مضامین جیسا اِس کتاب میں شامل ہیں۔ قریب ایک سو زائد شائع ہو چکے ہیں۔ اقبالؔ کے کلام میں "شانِ خلیلؑ" کی تلاش کا محرک ہو سکتا ہے کہ ایک مشہور مفسرِ قرآن، جنہیں اقبالؔ سے ذاتی رابطہ بھی تھا، کے درج ذیل جملے رہے ہوں جو میرے ذہن میں محفوظ تھے مگر روبہ عمل نہ ہو سکے تھے کہ:۔

"سب جانتے ہیں کہ اقبالؔ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ اُنہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں وہ مبتدی نہ تھے بلکہ مُنتہی فارغ التحصیل تھے..... جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اُس کا سمندر پئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اُس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا..... بلکہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اُتر چکا تھا۔"

"لیکن اِس کے باوجود اِس شخص کا کیا حال تھا؛ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اُس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اُس کی گہرائیوں میں جتنا اُترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دُنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گُم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اُس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے

دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اُس کے نزدیک شئے واحد تھے اور اس شئے واحد میں وہ اِس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اُس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی، بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو"

یہ ہیں اقبال کی فنافی القرآنیت پر جملے اس عالم دین کے جس نے خود اپنی ساری زندگی فنافی القرآنیت میں ختم کر دی اور جو میرے لئے اقبال کے کلام میں شانِ خلیلؑ کی تلاش کا محرک ہے۔ مگر اب کی دُنیا میں بھی ایسے لوگ جیسے سجاد انصاری موجود ہیں جنہوں نے اقبال کے کلام کو قرآن کی روشنی میں پیش تو نہ کیا مگر اقبال کی فنافی القرآنیت پر اپنی کتاب "محشرِ خیال" میں یہاں تک کہا کہ :-

" اقبال کو جب پڑھتا ہوں، خدا یاد آتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔ اقبال جب کہتے ہیں: "مرا حرفے ست در دل" تو میں اُن پر اُس خلوص سے ایمان لاتا ہوں جس طرح روحیں پیمانِ الست کے سلسلے میں ایمان لائی تھیں"۔

اب اسے بھی میں اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ ۱۹۸۶ء کے وسط میں دانش بک ڈپو، ٹانڈہ (فیض آباد) نے خود سے مجھے پیش کش کی کہ وہ میرے سارے ایسے مضامین کو جن میں اقبال کے کلام کو قرآن کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے چار جلدوں میں کتابی شکل دینے کو تیار ہیں۔ مجھے اِس پیش کش سے ایک تو خوشی اِس لئے ہوئی کہ شاید اقبال کی یہ دُعا کہ "میرا نورِ بصیرت عام کر دے" اب نشر و اشاعت کے ذریعے مستجاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اور اِس برصغیر ہندو پاکستان کی فہرستِ کتب میں جہاں "اقبالیات" کے تحت کتابوں کے ناموں سے صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں وہاں شاید اقبال کے "نورِ بصیرت" کو بھی کسی گوشہ میں جگہ مل سکے۔ دوسرے یہ خیال بھی گزرا کہ "خارا گدازی" کے کام میں لگے صرف افراد ہی کی کمی نہیں بلکہ نشر و اشاعت کے اداروں کی بھی کمی نہیں جو اقبال کے "نورِ بصیرت" کو بھی جگہ دینے کو تیار ہیں۔ میں دانش بک ڈپو کے اِس جذبے کو انتہائی قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کیونکہ بقول اقبال: "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"۔

چنانچہ دانش بک ڈپو نے میرے ایسے ہی مضامین کا پہلا مجموعہ موسوم بہ: "رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی (اقبال کے اشعار قرآن کی روشنی میں)" جنوری ۱۹۸۹ء میں شائع کیا جو قریب ڈھائی سو صفحات

پر مشتمل ہے۔ اُن کے ذریعے میرے ایسے ہی مضامین کا دوسرا مجموعہ موسوم بہ: "مجھے ہے حکم اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ (اقبالؔ کے اشعار قرآن کی روشنی میں)" اس کتاب کی اشاعت کے قبل انشاء اللہ منظرِ عام پر آجائے گا کیونکہ یہ طباعت کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اور اب یہ تیسری کتاب ہے جو قارئین کی نظروں سے گذر رہی ہے۔

اس کتاب میں ایک مضمون بہ عنوان: "نظم "جواب شکوہ" (قرآن کی روشنی میں)" شامل ہے۔ تاکہ قارئین دین و ایمان کے اُن نکتوں کو جو اقبالؔ اس نظم میں ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں بہتر طور پر گرفت میں لا سکیں میں نے اس کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر۲ کے تحت پوری نظم "شکوہ" نقل کر دیا ہے کیونکہ جواب شکوہ" میں اُنہی باتوں کا جواب دیا گیا ہے جن کی شکایت نظم "شکوہ" میں کی گئی ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اِس مضمون کو شروع کرنے سے قبل وہ نظم "شکوہ" کا پہلے مطالعہ کر لیں تو زیادہ لُطف آئے گا۔

ناشر کے بار بار اصرار پر اِس کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر۱ میں "حل لغات" کے عنوان سے مضامین کی ترتیب کے مطابق ہر مضمون میں اقبالؔ کے جتنے اشعار ہیں اُن میں مشکل الفاظ کے معنی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ مضمون ہی میں ہر شعر کو عام فہم بنا دیا جائے۔ نہیں معلوم میری یہ کوششیں میری مقصدیت میں کہاں تک ممد و معاون ہوتی ہیں۔

آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ میرے مضامین میں ادب کی تلاش نہ کی جائے۔ کیونکہ مجھے اپنی ادبی کم مائگی کا احساس ہے۔ دوسرے میں اُردو ادب کا مردِ میداں نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ادب کے معاملہ میں مجھے "پیدل سواروں" میں شمار کر لیا جائے تو یہی میرے لئے باعثِ فخر ہوگا۔ میں نے اقبالؔ ہی کے اِن جملوں پر عمل کیا ہے جو انہوں نے اپنے خط مورخہ ۱۹؍اگست ۱۹۲۳ء میں سردار عبد الرب نشتر کو لکھا تھا کہ:۔

"زبان کو میں ایک بُت تصوّر نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں"۔

خُدا کرے دانش بُک ڈپو کی شائع کردہ میری ایسی دو کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی قارئین کے لئے روحانی مسرّتوں کا باعث بنے۔

محمد بدیع الزماںؒ
(ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ)
ہارون نگر کالونی۔ فرسٹ سیکٹر پھلواری شریف۔ پٹنہ 801505

۷۸۶

خُدائے زِندہ زِندوں کا خُدا ہے

اِس مضمون کا عنوان اقبالؔ کی درج ذیل رُباعی کا ایک مصرعہ ہے جس رباعی کا، قرآن کی روشنی میں مطالعہ کیا جانا مقصود ہے :-

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا، آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

("بالِ جبریل")

اقبالؔ نے اِس رُباعی میں قرآنی روح کو چار مصرعوں میں احاطہ کر کے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں سے مخاطب ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ تیرے نفس امّارہ (سورۃ یوسف ۱۲ آیت ۵۳) نے تیرے بدن سے قرآنی روح کو نکال پھینکا ہے اور نتیجتاً تیرا تن اسلام اور قرآنی روح سے ناآشنا ہو کر رہ گیا ہے اور انہی وجوہات کی بنا پر تیری آہیں خدا تک نہیں پہنچ پاتیں۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ دینِ اسلام سے تیری بیگانگی کا پانی سر سے اتنا اونچا ہو چکا ہے کہ تیری مردہ روح سے خدا بیزار ہے اور گرچہ تو خود کو زندہ سمجھتا ہے مگر خدا کی نگاہ میں تو مُردہ ہے۔ خدا چونکہ برحق ہے یعنی زندہ ہے اس لئے وہ مردوں کی طرف اپنی نظرِ التفات تک نہیں کرتا کیونکہ وہ تو صرف زندوں کا خدا ہے مُردوں کا نہیں۔ باتیں تو اقبالؔ نے اتنی ہی سی کہی ہیں مگر ہر مصرعہ میں ایمان ویقین کے وہ سارے نُکتے ذہن نشین کرائے گئے

ہیں جو تخلیقِ آدم، رسولوں کی بعثت اور نزولِ قرآن کے مقاصد میں شامل ہیں۔

اقبالؔ نے پہلے شعر میں "روح" اور دوسرے شعر میں "بے روح" کے الفاظ استعمال کئے ہے جو اس رُباعی کے کلیدی الفاظ ہیں۔ خُدا نے تخلیق آدمؑ کے وقت جو روح انسان کے جسم میں پھونکی ہے اُسے اُس نے اپنی روح بتایا ہے۔ فرمایا خدائے تعالیٰ نے فرشتوں سے :۔

"جب میں اِسے (بشر) پورا بنا چکوں اور اِس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں (وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) تو تم سب اُس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔

(سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۲۹)

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کے جسم میں جو روح کارفرما ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا اس کا ہلکا سا ایک پرتو ہے۔ حیات، علم، قُدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں اُنہی کے مجموعہ کا نام روح ہے۔ اور اِسی پرتو کی وجہ کر انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا۔ مگر صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پالینا اُلوہیت کا کوئی جُزو پالینے کا ہم معنی نہیں کیونکہ اُلوہیت اس سے وراء الورا ہے کہ کوئی مخلوق اُس کا ادنیٰ سا شائبہ بھی پا سکے۔

روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور، عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحبِ انا ہستی اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔ خدا صرف اپنی روح پھونک کر ہی نہیں رہ گیا بلکہ جیسا سورۃ "السجدۃ ۳۲" کی درج ذیل آیت ۹ میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

"پھر اُس کو نک سک سے درست کیا (ثُمَّ سَوّٰىهُ) اور اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی (وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ)، اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے، تم لوگ کم ہی شکر گذار ہوتے ہو"

کان اور آنکھوں سے مُراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے مگر دل سے مُراد وہ ذہن ہے جو ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کو مُرتب کر کے اُن سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف راہوں

میں سے کوئی ایک راہ منتخب کرتا اور اُس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ مگر باوجودیکہ انسان اپنے جسم میں وہ روح رکھتا ہے جس پر ہلکا سا ہی سہی، مگر پھر بھی خدائی صفات کا پرتو ہے اور وہ صحیح فطرت پر پیدا بھی کیا گیا ہے مگر بعد میں وہ اپنے کو خدا سے بے نیاز سمجھ کر خارج سے کفر و شرک اور گمراہی اپنے اوپر عارض کر لیتا ہے۔ خدا نے انسان کو ایمان و کفر میں سے کسی ایک پر اختیار کرنے پر بھی مجبور نہیں کیا ہے اور اسی لئے ہر انسان ایمان اور کفر دونوں کا خود ذمہ دار ہے اور اسی وجہ کر صحیح فطرت پر پیدا کئے جانے کے بعد بھی کوئی ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے جو اس کی فطرت کے مطابق ہے اور کوئی کفر کی ڈگر پکڑتا ہے جو اس کی خِلقت و آفرینش کے خلاف ہے۔

اقبالؔ نے اس رباعی کے پہلے مصرعہ میں، مسلمانوں کو روح کے انہی سارے قرآنی نکتوں کو ذہن نشیں کراتے ہوئے اُن پر تاسف کیا ہے کہ خُدا نے تو تجھ میں صرف اپنی ہی روح نہیں پھونکی تھی بلکہ خلافت کے منصب جلیلہ پر فائز کئے جانے کا مستحق بننے کے لئے تمہیں فکر و شعور، عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل تک بنایا تھا اور تیری ہدایت کے لئے پے در پے رسولوں کو مبعوث بھی کیا اور قرآن کی شکل میں تیرے لئے آخری ہدایات بھی نازل فرمائی مگر چونکہ خدا نے تم کو ایمان و کفر میں کسی کو اختیار کرنے کی آزادی دے رکھی تھی اس لئے تو نے اِس اختیار کا غلط استعمال کیا۔ نتیجتاً تیرے جسم میں جو روح کارفرما ہے وہ رسولوں کے ارشادات اور قرآن کی تعلیمات سے نا آشنا ہے۔

اس رباعی کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ یہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ تم اگر آج اپنے کو ذلیل و خوار پاتے ہو اور تمہاری آہ نارسا رہ جاتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہارے جسم میں قرآنی روح نہیں ہے کیونکہ خدا کا خود ارشاد ہے کہ :-

"اے نبی، لوگوں سے کہو : "میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو جب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے (فَقَدْ كَذَّبْتُمْ) عنقریب وہ سزا پاؤگے کہ جان چھڑانی محال ہوگی" ــــ (سورۃ الفرقان ۲۵- آیت ۷۷)

" تمہارا رب کہتا ہے : "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے مُنہ موڑتے ہیں (اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ

عِبَادَتِی)، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے (سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ)" —— (سورۃ المؤمن ۴۰ - آیت ۶۰)

اِس مصرعہ میں اقبالؔ نے یہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ اگر تیری آہیں خدا تک نہیں پہنچ پاتیں تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خدا خود فرماتا ہے کہ میری نظرِ التفات صرف اُن بندوں پر پڑتی ہے جو میری ذات اور صفات اور میری باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ارشاد ہے :-

"پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اُٹھائی اور وہ اُسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ اُن کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اِس کے کہ اُن کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔" —— (سورۃ التوبہ ۹ - رکوع ۱۳)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے اُنہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔ اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے (وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ)"

(سورۃ العنکبوت ۲۹ — آیت ۶۹)

"اے نبیؐ، تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ اُنہیں طاغوت سے کُفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان اُنہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے... نہیں، اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں (وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)

"..... حالانکہ جو نصیحت اُنہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ اِن کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم اِنہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور اُنہیں سیدھا راستہ دکھاتے"

(سورۃ النساء ۴ - رکوع ۹)

اِس رُباعی کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "تنِ بے روح" سے مُراد "دلِ مُردہ" رکھنے والے اور دوسرے مصرعہ میں "زندوں کا خدا" سے مراد "دلِ زندہ رکھنے والے ہیں۔ قرآن کی رو سے "زندہ" سے مُراد سوچنے اور سمجھنے والے انسان ہیں جن کی حالت پتھر کی سی نہ ہو کہ اُس کے سامنے خواہ کتنی ہی معقولیت کے ساتھ حق اور باطل کا فرق بیان کیا جائے اور کیسی ہی دردمندی کے ساتھ اُس کو نصیحت کی جائے وہ نہ کچھ سُنے اور نہ کچھ سمجھے۔ فرمایا :-

" یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبردار کرے جو زندہ ہو (لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا) اور انکار کرنے والوں پر حُجت قائم ہو جائے" (سورۃ یٰسین ۳۶ - رکوع ۵)

خُدا نے تمثیلی پیرایہ میں مومن کو "زندہ" سے اور ہٹ دھرم کافروں کو "مُردہ" سے بھی تشبیہہ دی ہے۔ ارشاد ہے۔

" جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مُردے مساوی ہیں (وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ)۔ اللہ جسے چاہتا ہے سُنواتا ہے۔ مگر (اے نبی) تم اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنیوالے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔"

(سورۃ فاطر ۳۵ - رکوع ۳)

"اِن میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری (نبیؐ کی) باتیں سُنتے ہیں، مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں! اِن میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں، مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ اُنہیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں"۔

(سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۵)

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اِن باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟) تباہی ہے اُن لوگوں کے لئے جن کے دِل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے۔ وہ کھُلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

—— (سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۲۲)

"دلِ زندہ" وہ "نفس مطمئنّہ" ہے جو خُدا سے بے دیکھے ڈرتا ہے اور تقویٰ کی راہ اپناتا ہے۔ ایسے مومن کا نفس اپنے سارے اعمال، افعال اور اقوال سے مطمئن ہے اور اُسے یقین ہے کہ اُسے خُدا کی رضا جوئی حاصل ہوگی اور وہ انشاء اللہ فلاح پائے گا۔ فرمایا گیا:۔

"سورج اور اُس دھوپ کی قسم، اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے، اور دِن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے، اور آسمان کی اور ذات کی قسم جس نے اُسے قائم کیا، اور زمین کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے بچھایا، اور نفسِ انسان کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا، پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا) اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا (وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا)"۔

—— (سورۃ الشمس ۹۱۔ رکوع ۱)

"تنِ بے روح" اور ایسے تن سے خدا کی بیزاری کو درج ذیل آیات کے پیشِ نظر گرفت میں لایا جائے:۔

"تباہی ہے اُس روز (روزِ آخرت) جھٹلانے والوں کے لئے جو روزِ جزا کو جھٹلاتے

ہیں اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اُسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے: "یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔" ہرگز نہیں، بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر اُن کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے"۔ —— (سورۃ المطفّفین ۸۳۔ رکوع ۱)

"بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہیں۔ مگر دراصل وہ خود اپنے ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اُس کا شعور نہیں ہے۔ اُن کے دِلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا ہے"۔ —— (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲)

"(جن لوگوں نے ظلم کی راہ اختیار کی ہے) اُن کے دِلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیے ہیں۔ جو اُنہیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے۔ اور اُنکے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے"۔ —— (سورۃ الکہف ۱۸۔ رکوع ۱۸)

اِن ساری آیات کے پیشِ نظر اقبالؔ نے دوسری جگہوں میں مسلمانوں کو "دلِ زندہ" پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

دلِ مُردہ دِل نہیں ہے اُسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

("ضربِ کلیم": غزل (جداز نظم "ہندی اسلام")

نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مُردہ کو موجِ سَراب بھی زنجیر!

("ضربِ کلیم": "خودی کی زندگی")

اور اگر آہیں نارسا ہیں تو اس کی وجہ بھی دِل کی موت ہی ہے۔ کہتے ہیں:—

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں

("بالِ جبریل": غزل ۲۰)

حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا کہ دِل کی موت ہے دوری!

("بالِ جبریل": غزل ۳۸)

اِس زیرِ تجزیہ رُباعی میں اقبالؔ نے سب سے آخری مصرعہ میں "خدائے زندہ" کی جو بات کہی ہے وہ درجِ ذیل آیۂ شریفہ کی ترجمان ہے :-

"اے نبیؐ، اُس خُدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں (وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ)۔ اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے" — (سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۵۸)

"اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ (اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ)" (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۲)

"اللہ: وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اُس کے سوا کوئی خُدا نہیں ہے۔ (اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ)" — (سورۃ البقرہ ۲ — رکوع ۳۴)

"وہی زندہ ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں (هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ)" — (سورۃ المؤمن ۴۰۔ رکوع ۷)

اور آخر میں ایک بار پھر "تن بے روح" سے خُدا کی بیزاری کو مندرجہ بالا آیات کے علاوہ درج ذیل آیات سے ذہن نشین کیجئے کیونکہ اس رُباعی کا یہ کلیدی شعر ہے۔ اِس بیزاری کی وجہ یہی ہے کہ:-

"پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی)

اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اُس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی اُن لوگوں پر مُسلط کر دیتا ہے۔ جو ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات اُن لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں" ـــ (سورۃ الانعام ۶ ـ رکوع ۱۵)

خُدا نے ایک موقع پر بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے اُن سے اپنی بیزاری کا اظہار اور اس بیزاری کی وجہ اس طرح فرمایا ہے کہ :-

" اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی' اور طُور کے دائیں جانب تمہاری حاضری کے لئے وقت مقرر کیا اور تم پر من و سلویٰ اُتارا ـــ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اُسے کھا کر سرکشی نہ کرو (وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ) ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے' پھر سیدھا چلتا رہے۔ اُس کے لئے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں" ـــ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۴)

" جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے، ہم اُس پر ایک شیطان مُسلط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں : اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں"

ـــ (سورۃ الزخرف ۴۲۔ رکوع ۴)

جب اقبالؔ اس پوری رُباعی کا یہ کلیدی نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ : خُدائے زندہ زندوں کا خُدا ہے" تو جہاں اُن کے ذہن میں بہت سے ایسے قرآنی قصّے رہے ہوں وہاں خُدا کا خود اپنے کو زندہ اور زندوں کا خُدا فرمانے میں درج ذیل مثال بھی اُن کے پیشِ نظر رہی ہو۔ وہ یہ کہ جب خُدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں جانے کا حکم دیا تو قرآن میں مذکور ہے کہ :-

" دونوں (حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور حضرت ہارون علیہ السّلام) نے عرض کیا : "پروردگار' ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ (فرعون) ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا" ـــ فرمایا : "ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں' سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں" ـــ (سورۃ طٰہٰ ۲۰ ـــ رکوع ۲)

نظم "جوابِ شکوہ"

(قرآن کی روشنی میں)

"بانگِ درا" میں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" اقبال کی دو طویل ترین طنزیہ نظمیں ہیں۔ انھوں نے نظم "شکوہ" میں خدا کے حضور شکایات کا ایک دفتر پیش کیا تھا۔ عالمِ اسلام کی بے بسی بے حسی اور بیچارگی اور اقوامِ مغرب کی سازشوں نے اُنہیں اِس درجہ متاثر کیا کہ اُن کا غصہ جھنجھلاہٹ اختیار کر گیا۔ اور چونکہ وہ اِن مسلمانوں کی مدد کرنے پر قادر نہ تھے اس لئے اُن کی یہ جھنجھلاہٹ تلخی بن کر "شکوہ" کی شکل میں سامنے آئی۔ یہ تقاضا تھا اُس ذہنی اور جذباتی پس منظر کا جس میں اُنہوں نے یہ نظم رقم کی۔ اِس نظم پر مخصوص حلقوں کی جبینوں پر شکنیں تک پڑ گئیں اور اقبالؔ کے دینی عقائد پر انگلیاں تک اُٹھ گئیں، مگر اُن کی خلوص نیتی نے اِسے گوارہ نہ کیا کہ وہ ان تنقیدات اور انگشت نمائی پر خاموش بیٹھیں چنانچہ موقع پا کر اُنہوں نے مسلمانوں کے سامنے ایک قدِ آدم آئینہ رکھ دیا جس میں وہ اپنے خد و خال دیکھ سکیں۔ اور اِسی آئینہ کو اُنہوں نے "جوابِ شکوہ" سے موسوم کیا۔

"جوابِ شکوہ" کا طنز ایک طرح سے عملِ جراحی ہے۔ جس سے اقبال کا مقصد اصلاح تھا یا یوں کہا جائے کہ: "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"۔ یہ نظم ایک بڑے ذہن کا "درد و داغ" اور "جستجوئے آرزو" ہے۔ اِس میں سینکڑوں اُچٹتی ضربیں اور ہزاروں کھُلے نشتر ہیں۔ جو ردِ عمل ہیں مِلّتِ اسلامیہ کی انتہائی پستی اور دین سے بے رغبتی کا۔ اس میں لطافت اور تلخی کے عناصر ہی صرف شامل نہیں ہیں بلکہ

اِس میں ایک خوش آئند مستقبل کا پیغام بھی ملتا ہے۔ اِس میں کہیں خطیبانہ ہیجان وطغیانی ہے تو کہیں ہلکی سی ناراضگی کا اظہار۔ مگر ہمدردی کا جذبہ، ساری نظم میں یکساں ہے۔ طنز کی یہ تیزی چونکہ ایک بڑے مقصد کے لئے کی گئی تھی اِس لئے یہ مقصدیت ہی اِس تلخی کو گوارا بنا سکی۔

گرچہ نظم "شکوہ" اردو شاعری میں آزادیٔ گفتار کی سنگِ بنیاد تھی مگر اِس کی اشاعت سے عام مسلمانوں میں یہ تاثر پیدا ہوگیا تھا کہ وہ تو اپنی جگہ دین کی رسی کو مضبوط پکڑے کھڑے ہیں جیسا کہ سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۰۳ میں تاکید فرمائی گئی ہے کہ: "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو" مگر اقبالؔ خُدا سے شکوہ کر بیٹھے۔ اِس لئے نظم "جوابِ شکوہ" میں قرآن کے اُن سارے ارشادات اور احکامات کو جو ایک مومن کے ایمان کے لازمی اجزاء ہیں ہر مصرعہ میں سمو کر مسلمانوں کو خود کو تولنے کی دعوت دی اور سوال کیا کہ: "تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟" اور اپنی نفسی کیفیات کا خود مطالعہ کرنا اس وقت بھی برمحل تھا اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا اس لئے کہ بقول اقبالؔ ہی: "تازہ ہر عہد میں ہے قصّۂ فرعون وکلیم"۔

اقبالؔ نے اِس نظم میں ایک ہوشمند فلسفی اور باکمال شاعر کی طرح اپنی نصیحتوں کو دلائل اور نشیب وفراز کے اصولوں سے پُرتاثیر بنا کر غیبی آواز میں عام مسلمانوں کو بیدار کرنے اور راہِ عمل پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ اپنے نشتروں سے دُکھتی رگوں کو درست کرنے میں اُنھوں نے بڑے حُسن سے کام لیا۔ لوگوں کو متوجہ پاکر پیغمبرانہ انداز میں گفتگو کی اور دوٹوک باتیں کہیں۔ اور اِس طرح مسلمانوں کے ذہنی اور عملی تعطل اور اُن کے غیر اسلامی عقائد وشعار کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔

چونکہ اِس نظم "جوابِ شکوہ" میں اقبالؔ نے نہ تو اپنے کو بہت بلندی پر رکھ کر عام مسلمانوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور نہ ناصح کی طرح اچھا بُرا کہنے ہی پر اکتفا کیا اس لئے لوگوں نے اُنہیں سوز وگداز کا پُتلا سمجھا اور یہ سمجھا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنا سمجھ کر کہتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔

اقبالؔ نے یہ نظم ۱۹۱۳ء میں لکھی تھی اور موچی دروازہ لاہور کے باہر اُس جلسہ میں سنائی تھی جو مولانا ظفر علی خاں صاحب کے زیرِ اہتمام جنگ بلقان کے سلسلہ میں منعقد ہوا تھا۔ اقبالؔ نے یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھکر سنائی۔ ترنم کے تقاضوں پر انھوں نے سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھنا مناسب ہے۔ اس نظم کے اختتام پر اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت

ہو گئیں اور تمام رقم بلقان فنڈ میں دے دی گئی۔

اس مضمون میں اس نظم کے زیادہ تر اشعار یا مصرعوں پر قرآنی آیات کے حوالے دیئے جا رہے ہیں کیونکہ انہی آیات کا ذہن نشیں کرانا اقبالؔ کا مقصود تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی منبر و محراب پر اُردو میں دیئے جانے والے خطبے ہوں یا محفلِ میلاد یا اور کوئی مجلس خطیب یا مقرر "جواب شکوہ" کا کوئی نہ کوئی شعر یا مصرعہ اکثر دہراتا ہے کیونکہ اس نظم کے ہر شعر کے ہر مصرعہ میں قرآنی آیات کو اس انداز میں سمویا گیا ہے کہ اِسے پڑھتے ہی دِل و دماغ پر قرآنی احکامات و تعلیمات کی گہری چھاپ پڑ جاتی ہے۔ اور ایک ذہنی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے تو ملّی اور دینی نظمیں بہت لکھی جاتی ہیں مگر ہر مصرعے کے الگ الگ ٹکڑوں تک میں خدائی احکامات و تعلیمات کو چند الفاظ میں سمو دینا یہ صرف اقبالؔ ہی جیسے قادر الکلام شاعر ہی سے ممکن تھا۔

اِس نظم میں ۳۶ بند ہیں اور ہر بند میں تین اشعار ہیں۔ ذیل میں ہر بند کے اشعار پر ایسے قرآنی آیات منطبق کئے گئے ہیں جو یا تو کسی آیت کی ہو بہو تلمیح ہیں یا اُن سے ماخوذ یا اُن پر مبنی۔

پہلا بند

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔۔۔ پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے ۔۔۔ خاک سے اُٹھتی ہے، گردوں پہ نظر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا

آسماں چیر گیا، نالۂ بے باک مرا

اِس پہلے بند میں اقبالؔ نے تمہید کے طور پر نظم "شکوہ" کا جواب یہ کہہ کر دیا ہے کہ یہ اُن کے دِل کی آواز تھی اور چونکہ اُن کی باتیں قدسی الاصل یعنی اپنی اصلیت کے لحاظ سے پاکیزہ تھیں اور جو ہمیشہ رفعت یعنی بلند قدروں پر نظر رکھتی ہیں۔ اِس لئے خلوصِ نیت سے کہی گئی باتوں کا اثر ہوا اور اُن کے شکوے خدا کے حضور تک پہنچ کر رہے کیونکہ اُن میں ان کے عشقِ الٰہی کے جذبات شامل حال تھے۔

دوسرا بند

پیرِ گردوں نے کہا سُن کے، کہیں ہے کوئی ۔۔۔ بولے سیّارے، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی

چاند کہتا تھا نہیں! اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ نہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

اس بند میں اقبالؔ کے طنز کے وہ تیر و نشتر ہیں جن کی چبھن اور خلش ایک صاحبِ ایمان ہی محسوس کر سکتا ہے۔ پہلے دو اشعار میں آسمان کی ساری مخلوقات کا اس بیباکی اور شوخی پر متحیر ہونا خدا کے اس ارشاد کی یاد دلاتی ہیں۔

" اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اس طرح اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔ وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے۔ اپنے رب سے جو اُن کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اُسی کے مطابق کام کرتے ہیں" ــــ (سورۃ النحل ۱۶ ــ رکوع ۶)

اب سوال یہ آتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ساری جاندار مخلوقات اور ملائکہ ہمیشہ اللہ کے آگے سربسجود رہتے ہیں اور سرکشی سوچ تک نہیں سکتے تو رضواں یعنی داروغۂ جنت نے یہ بے باکی اور شوخی انسان کے سر کیوں تھوپی۔ اقبالؔ اس بند میں قرآن کا یہی نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ سرکشی، نافرمانی اور بے باکی تو انسان کی سرشت میں داخل ہے جس کا مظاہرہ آغازِ تخلیق ہی کے وقت اس " خاک کی چٹکی " نے کیا تھا اور جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکال کر زمین پر پھینک مارا گیا۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :-

" ہم نے اِس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا۔ مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب تو سجدہ کر گئے، مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اِس پر ہم نے آدم سے کہا کہ : " دیکھو، یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دُشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔" لیکن شیطان

نے اُس کو پھسلایا۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اُس کے رب نے اُسے برگزیدہ کیا اور اُس کی توبہ قبول کر لی، اور اُسے ہدایت بخشی اور فرمایا "تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے"۔

—— (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۷)

اِس نافرمانی کا ذکر اور اِس سے پیدا شدہ نتیجے کا ذکر دوسرے موقع پر اِس طرح فرمایا گیا ہے کہ:-

"پھر ہم نے آدم سے کہا کہ: تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنّت میں رہو اور یہاں بافراط جو چاہو کھاؤ۔ مگر اُس درخت کا رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں سے شمار ہو گے"۔ آخرکار شیطان نے اِن دونوں کو اُس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور اُنہیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا: "اب تم یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت (قیامت) تک زمین پر ٹھہرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے"۔ —— (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۴)

تیسرا بند

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا! عرش والوں پہ بھی کُھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انسان کی تگ و تاز ہے کیا آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا!

غافل آداب سے سُکّانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

اِس بند میں اقبالؔ نے خُدا سے بے حجابانہ شوخی و گستاخی پر ایک طرف تو انسان کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنی تخلیق کی حقیر ابتدا کی یاد "خاک کی چٹکی" کہہ کر دلائی ہے اور دوسری طرف اپنے ضمیر کو ان بے ادبیوں پر ملامت بھی کیا ہے۔ "خاک کی چٹکی" ماخوذ ہے درج ذیل آیات سے:-

"ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹّی کے سوکھے گارے سے بنایا"

—— (سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۲۶)

"ہم نے انسان کو مٹی کے سَت سے بنایا۔ پھر اُسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اُسے ایک دوسری مخلوق بنا کھڑا کیا" ___ (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ رکوع ۱)

" اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہوکر (زمین میں) پھیلتے چلے جارہے ہو" ___ (سورۃ الروم ۳۰۔ رکوع ۲)

چوتھا بند

اِس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے   تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟

عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے   ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

نازِ ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اِس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ: "اِس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے" درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اُسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔" ___ (سورۃ یٰسین ۳۶۔ رکوع ۵)

" اُس نے اِنسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔" ___ (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱)

" ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اِنسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے" ___ (سورۃ الکہف ۱۸۔ رکوع ۸)

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے: "تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟" میں خُدا کے تعجب کا اظہار کیا گیا ہے اور ان باتوں کی یاد دلائی گئی ہے کہ یہ وہی انسان ہے جس کی

تخلیق سڑی گلی مٹی سے کی گئی تھی اور جیسے خُدا نے اُن لکھو کھا فرشتوں سے سجدہ کرایا تھا جو صرف خدا کے آگے سربسجود ہونا اور اُس کی تسبیح و تقدیس ہی کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اور آج یہ انسان اپنی اِس فضیلت کو بھول بیٹھا اور گمراہوں میں شامل ہوگیا۔ اِس مصرعہ میں جن آیات کی یاد دلائی گئی ہے اُن میں چند درج ذیل ہیں :-

" پھر اُس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ : " میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں، جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اُس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے " ـــ (سورۃ الحجر ۱۵۔ رکوع ۳)

" اور یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ : " آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اُس نے کہا : " کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے ؟" ـــ پھر وہ بولا : دیکھ تو سہی ! کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی ؟" ـــ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ رکوع ۷)

" پھر ذرا اُس وقت کا تصوّر کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ : " میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں "۔ اُنہوں نے عرض کیا : " کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اُس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا ؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں"۔ فرمایا : " میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے "۔

ـــ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۴)

پانچواں بند

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا ۔۔۔ اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا ۔۔۔ کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حُسنِ ادا سے تو نے
ہم سُخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

اقبالؔ نے نظم "شکوہ" کے پہلے ہی بند میں یہ کہہ کر کہ: "شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو" اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تھا۔ اور "جواب شکوہ" کے اس بند میں ایک تو اقبالؔ نے یہ تسلی کی ہے کہ ہم نے "شکوہ" لکھ کر کم از کم بندوں کو خدا سے ہم سخن تو کر دیا کیونکہ جب باتیں دو بدو ہوتی ہیں تو راہِ عمل نکل ہی آتی ہے۔ اور یہی اُن کا مقصد تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اگر شکوہ بھی کیا تو شکر کے طریقہ پر کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے کہ :۔

"عمل کرو شکر کے طریقے پر۔ میرے بندوں میں کم ہی شکر گذار ہیں"۔
— (سورۃ سبا ۳۴۔ رکوع ۲)

اقبالؔ نے تعلی اس لئے کی چونکہ ارشاد ہے :۔
"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رو برو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے۔ یا پھر کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے۔ وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے"۔ — (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۵)

چھٹا بند

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں	راہ دکھلائیں کسے! رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں	جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ درجِ ذیل آیات کا ترجمان ہے :۔
"اے نبیؐ، لوگوں سے کہو۔" میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اُس کو نہ پکارو" — (سورۃ الفرقان ۲۵۔ رکوع ۶)

اس پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ: "راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں" میں درج ذیل آیات کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

"لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے اُن کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ اُن کو دکھا دے گا!" —— (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۴)

"پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کے طلب میں رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات گگر پر اُٹھائی اور وہ اُسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؛ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔" (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۳)

"اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں (یعنی جنہوں نے اس صداقت کو قبول کرلیا۔ جو قرآن میں نازل کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے، انہیں اُن کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا۔"

—— (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۱)

"اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا جو اس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔" —— (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱۴)

"کہو، "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے" —— (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے اُنہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے" —— (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۷)

"بیشک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت اور دُنیا دونوں

کے ہم ہی مالک ہیں۔ پس میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں جھلسے گا وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا"

—— (سورۃ الیل ۹۲۔ رکوع ۱)

"اے محمدؐ.... جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اُس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا ۔ اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھاتے"

—— (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۹)

"اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا" —— (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۳)

"اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا" —— (سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۹)

"جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہوا اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالے کہ اُس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اُسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے" —— (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۱۵)

اس بند کا دوسرا شعر درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں اکثر لوگ سنتے اور دیکھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے" —— (سورۃ الفرقان ۲۵۔ رکوع ۴)

اس بند کے آخری شعر کے پہلے مصرعہ میں یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ خدا نے کسی کو "شان کئی" یعنی شوکت شاہانہ اور قدر و منزلت عطا فرمائے جانے کے لئے کچھ قابلیت کی شرط رکھی ہے۔ ایران کے قدیم بادشاہوں کا لقب کیخسرو، کیقباد و کیکاؤس وغیرہ تھا اور اقبال نے اپنے کلام میں انہی کی شوکتِ شاہانہ کے لئے "کے" یا "کئی" کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ جیسے "ضرب کلیم" کی نظم "سرود

میں کہتے ہیں ۔

دل کیا ہے ؟ اِس کی مستی و قوت کہاں سے ہے ؛
کیوں اِس کی ایک نگاہ اُلٹتی ہے تخت و کے ؛

اس شعر میں جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ : " کوئی قابل ہو " تو وہ قرآن کے جن نکتوں کو ذہن نشیں کراتے ہیں اُس پر چند آیات نقل کی جاتی ہیں :۔

" اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے ۔ اِس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے ۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی ۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دِل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی ۔ (اور وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں) تاکہ اللہ اُن کے بہترین اعمال کی جزا اِن کو دے ۔ اور مزید اپنے فضل سے اُن کو نوازے ۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے "۔

— (سورۃ النور ۲۴ ۔ رکوع ۵)

" ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے ۔ تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اُس کا شیوہ ہے "۔

— (سورۃ الانعام ۶ ۔ رکوع ۱۶)

" اللہ کے یہاں تو اُنہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اُس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا ۔ وہی کامیاب ہیں "۔

— (سورۃ التوبہ ۹ ۔ رکوع ۳)

" جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور وہ اُسے اپنے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو ۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اُس کے لئے وہ کافی ہے ۔ اللہ اپنا

کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔"

—— (سورۃ الطلاق ۶۵ - رکوع ۱)

اب ان آیات کے پیش نظر اگر "ضربِ کلیم" کی نظم "سرود" کا مندرجہ بالا شعر پھر پڑھیں تو یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا کہ "شانِ کئی" عطا کئے جانے کے لئے کون سی قابلیت درکار ہے یا "تختِ کئی" کو ایمان کی کون سی مستی و قوت الٹ ڈالتی ہے۔

اقبال نے اس بند کے پہلے شعر میں "راہ" اور "رہروِ منزل" کی باتیں کی ہیں۔ "راہ" سے اُن کی مُراد "صراطِ مستقیم" اور "رہروِ منزل" سے مُراد اُس صراط پر چلنے والے ہیں کیونکہ یہی دُعا انسان ہر روز پانچ وقت کی نمازوں میں "سورۃ الفاتحہ" میں مانگتا ہے۔ اور جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ: "راہ دکھلائیں کسے؟" تو وہ مسلمانوں پر طنز کرتے ہیں کہ تم میں "صراطِ مستقیم" کی ڈگر کس نے پکڑ رکھی ہے کہ خدا اُسے اپنے فضل سے نوازے؟ اس بند کے آخری شعر میں وہ اُن "رہروِ منزل" کی یاد دلاتے ہیں جنہوں نے ایمان کی ڈگر پر چل کر قدر و منزلت حاصل کی جس کی ان گنت مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ایک موقع پر فرمایا گیا :-

"پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی (وہی راہِ راست جو) اُس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اِسی طرح ہم نیکوکاروں کو اُن کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اُسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک اُن میں سے صالح تھا۔ (اُسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ، الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو (راستہ دکھایا) اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دُنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز اُن کے آباؤاجداد اور اُن کی اولاد اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، اُنہیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف اُن کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو

ان سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا"۔ (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۱۰)

اقبالؔ نے اس شعر میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ :۔

"اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔ (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

"آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے۔ اگر تم شکر گزار بندے رہو۔ اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے"۔ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۱)

ساتواں بند

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں ۔۔۔ اُمتی باعثِ رُسوائی پیغمبرؐ ہیں
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں ۔۔۔ تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آذر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بُت بھی نئے، تم بھی نئے

قبل اس کے کہ اِس بند کے ہر شعر یا ہر شعر کے ہر مصرعہ پر قرآنی آیات کا حوالہ دیا جائے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ پورا بند مجموعی طور پر قرآن کے کن نکتوں کو ذہن نشین کراتا ہے اُسے پیشِ نظر رکھا جائے۔ ایسی ہی چند آیات درج ذیل ہیں :۔

"(ابلیس سے) پوچھا: "تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟"۔ بولا: "میں اُس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے"۔ فرمایا: "اچھا، تو یہاں سے نیچے اُتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا۔ کہ در حقیقت تو اُن لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں"۔ بولا: "مجھے اُس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے"۔ فرمایا: "تجھے مہلت ہے"۔ بولا: "اچھا جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے، میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر اِن انسانے

انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا - آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اُن کو گھیروں گا۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا" ــــ فرمایا:
نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ اُن میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھے سمیت اُن سب کو جہنم میں بھر دوں گا"

(سورۃ الاعراف ۷ ــ رکوع ۲)

قطع کلامی ضرور ہوگی مگر "بالِ جبریل" کی نظم "جبریل و ابلیس" درج ذیل شعر سے لطف اُٹھائیے جسمیں اُنہوں نے ابلیس کے اُس عزم کی ترجمانی کی ہے کہ: "میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر اُن انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا - آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اُن کو گھیروں گا' اور تو اُن میں سے اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا"۔ اس نظم میں جو جبریلؑ اور ابلیس کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے ابلیس حضرت جبریلؑ کو اپنے اسی عزم کی یاد دلا کر کہتا ہے ؎

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو!

اس ساتویں بند میں اقبالؔ نے یہ نکتہ بھی ذہن نشیں کرایا ہے کہ خدا کہتا ہے :-

"میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اُسے میں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے" ــــ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۸)

اس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ: "ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دِل خوگر ہیں" میں اقبال نے جن ایمانی نکتوں کو ذہن نشیں کرایا ہے وہ درج ذیل آیات پر مبنی ہیں :-

" اے نبیؐ، تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اِس کتاب پر، جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ اُنہیں طاغوت سے کُفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان اُنہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے

اور آؤ رسول کی طرف، تو اِن منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں" ۔۔۔ (سورۃ النسآء ۴۔ رکوع ۹)

"اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی اور سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا" ۔۔۔ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۸)

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ کہکر کہ: "اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبرؐ ہیں" قرآن کی بہت ساری آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا گیا ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

"(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے) جو اِس پیغمبر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کریں ..... جو لوگ اُس پر ایمان لائے ہیں اور اُس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اُس کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں ..... پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی۔ اُمید ہے کہ تم راہ راست پا لوگے" ۔۔۔ (سورۃ الاعراف رکوع ۱۹ اور ۲۰)

"ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "اُمتِ وسط" بنایا ہے تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو" ۔۔۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۷)

"ہر اُمت کے لئے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی اُمت کے پاس اُس کا رسول آجاتا ہے تو اُس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے۔ اُس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا" ۔۔۔ (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۴۷)

دوسرے شعر کے پہلے مصرعے: "بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں" میں "بُت شکن" اور "بُت گر" درج ذیل آیات کے ترجمان ہیں:-

"اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا۔ جب اُس نے باپ اور اپنی قوم سے کہا، "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گڑھے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ اور آخر رب العالمین کے معاملے میں تمہارا کیا گمان ہے؟"۔

پھر اُس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا: "میری طبیعت خراب ہے"۔ چنانچہ وہ لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا: "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں؟ کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟"۔ اِس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں" ___ (سورۃ الصّٰفّٰت، ۳۷۔ رکوع ۳)

اِس بند کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے: "تھا براہیمؑ پدر اور پسر آذر ہیں" میں اقبالؔ نے الفاظ "پدر" اور "پسر" کو اُس طرح استعمال کیا ہے جیسے انگریزی میں PUN اور اردو میں ایہام یعنی ذو معنی والے الفاظ کہتے ہیں۔ اس مصرع میں اقبالؔ درج ذیل مکالمے، جو قران میں مذکور ہیں کی یاد دلاتے ہیں جو پدر (آذر) اور پسر (حضرت ابراہیمؑ) کے درمیان ہوئی جس سے اُن کی مُراد یہ ذہن نشیں کرانا ہے کہ اِس کے برعکس آج صورتِ حال یہ ہے کہ پدر پسر بن گیا ہے اور پسر پدر یعنی جو "بُت شکن" تھے وہ "بُت گر" نظر آ رہے ہیں:۔

"اور اِس کتاب (قران) میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو۔ بیشک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ (اِنہیں ذرا اُس موقع کی یاد دلاؤ) جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ: "ابا جان، آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں۔ اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں۔ ابا جان، میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں۔ میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں۔ شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔" باپ (آذر) نے کہا: "ابراہیمؑ، کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا"۔ ابراہیمؑ نے کہا: "سلام ہے آپ کو، میں اپنے رب سے دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ، خُدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ اُمید ہے کہ

میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا" — (سورۃ مریم ۱۹۔ رکوع ۳)

اس بند کا آخری شعر مجموعی طور پر درج ذیل آیات پر مبنی ہے :-

"ان لوگوں (منکرین) نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے پشتیبان ہوں گے۔ کوئی پشتیبان نہ ہوگا۔ وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور اُلٹے اُن کے مخالف بن جائیں گے" — (سورۃ مریم ۱۹۔ رکوع ۵)

"اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا: "کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟" — تو وہ جواب دیں گے: "پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اُن لوگوں سے۔ دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں (شیاطین جن) کی عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ان ہی پر ایمان لائے ہوئے تھے" — (سورۃ سبا ۳۴۔ رکوع ۵)

"کیا یہ لوگ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے اُن کے لئے دین کا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا" — (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۳)

"اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اور اس وجہ سے کہ اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔

— (سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۳۰)

"لوگو، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو"۔

— (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۳)

"کیا انسان جو کچھ چاہے اُس کے لئے وہی حق ہے"۔ (سورۃ النجم ۵۳۔ آیت ۲۴)

اِس آخری شعر کے دوسرے مصرعے: "حرم کعبہ نیا، بُت بھی نئے، تم بھی نئے" میں "حرمِ کعبہ نیا" کہ کر اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی یاد دلائی ہے :-

"اگر تم نے اِس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، اِن اہلِ کتاب کی خواہشات (قبلہ کے معاملے میں) کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں

ہوگا۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب (قرآن) دی ہے، وہ اس مقام کو جس کو قبلہ بنایا گیا ہے (یعنی کعبۂ محترم) ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر اُن میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے" ۔۔۔ (سورۃ البقرہ۔ رکوع ۱۷)

آٹھواں بند

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا ۔۔۔ نازشِ موسمِ گُل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا، اللہ کا سودائی تھا ۔۔۔ کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کرلو
اُمتِ احمدؐ مُرسل کو مقامی کرلو

اِس بند میں اقبالؔ نے نظم "شکوہ" کے بائیسویں بند کے اِس شعر کا جواب دیا ہے کہ ؎
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے! (دیکھیں ضمیمہ نمبر۲)

اِس بند میں اقبالؔ نے مسلمانوں پر طنز کیا ہے کہ تمہاری تاریخ میں ایک دَور وہ بھی تھا کہ "نازشِ موسمِ گُل لالۂ صحرائی تھا" یعنی جب کہ مسلمانوں کی شان صرف اللہ اور اُس کے رسولؐ سے انتہائی گرویدگی میں مضمر تھی اور یہی گرویدگی اُن کے لئے مایۂ رعنائی تھی۔ اقبالؔ یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ آج اگر خدا کی نظرِ التفات تم پر نہیں تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا مجازی محبوب کی طرح ہرجائی ہے بلکہ تم نے کسی یکجائی کی وجہ سے اور اپنی گرویدگی ماسوا اللہ کے دوسروں کے ساتھ رکھ کر اپنے کو ذلیل و خوار کرلیا ہے جیسے آخری شعر میں انہوں نے "عہدِ غلامی کرلو" کہا ہے۔ تم نے "اُمتِ احمدؐ مرسل" کو، جو کسی جغرافیائی حدود کی پابند نہ تھی، اپنے کو حسب نسب، ذات پات کی بنیادوں پر تقسیم کرکے اُسے مقامی بنا ڈالا اور اِس دین کی آفاقی ہمہ گیریت کو ختم کر ڈالی۔

اِس بند کے دوسرے شعر میں اللہ سے انتہائی گرویدگی ہی قوم و ملت کی بقا و خوش حالی کی ضامن بتائی گئی ہے اور اِس شعر کا یہ مصرعہ: "جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا" اُن آیات کا ترجمان

ہے جن میں اللہ سے انتہائی گرویدگی ہی ایمان کی پہچان بتائی گئی ہے۔ چند ایسی آیات درج ذیل ہیں:

"اے نبیؐ، کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیمؑ کا طریقہ، جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو: "میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اِسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔" کہو: "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہے"؟

—— (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۲۰)

"(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کھُلے کھُلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اُس کا ہمسر اور مدِ مقابل بناتے ہیں، اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھکر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ)" —— (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو۔ شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے" —— (سورۃ المآیدۃ ۵۔ رکوع ۶)

"جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ ہی اللہ کو پسند ہیں" —— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۷۶)

نواں بند

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

اس بند کے پہلے شعر میں بات "پیار" کی لائی گئی ہے جس سے اقبال کی مراد اُس آیت کی یاد دلاتی ہے کہ:۔

"ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھکر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ"۔۔۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲۰)

پہلا شعر نماز فجر سے متعلق ہے اور اس کی اہمیت پر خصوصی آیات کی یاد دلائی گئی ہے جو درج ذیل ہیں:۔

"نماز قائم کرو، زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک۔ اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے (یعنی خدا کے فرشتے خاص طور پر اُس کے گواہ بنتے ہیں)" ۔۔۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷،۱۔ رکوع ۹)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ "صبح کی بیداری" گراں ضرور ہے کیونکہ خدا نے تو ہر نماز ہی کو مشکل بتایا ہے مگر انہوں نے اس شعر میں "کس قدر" کہہ کر مسلمانوں کی خوابیدہ روح پر تازیانہ لگایا ہے کہ یہ "گراں" ضرور ہے مگر اس قدر نہیں جتنا تم نے اسے بنا دیا ہے کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ نماز گراں صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو نافرمان ہیں اور آخرت پر سرے سے یقین نہیں رکھتے۔ ارشاد ہے:۔

"صبر اور نماز سے مدد لو۔ بیشک نماز ایک سخت مشکل کام ہے مگر اُن فرمانبردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۵)

"جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اُس پر ایک شیطان مُسلّط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں"۔

۔۔۔ (سورۃ الزخرف ۴۳۔ رکوع ۴)

ایسے تو اس بند کا پہلا شعر بظاہر نمازِ فجر سے متعلق ہے لیکن اگر ہم نماز کی اولیت، فضیلت اور اہمیت پر سارے قرآنی احکامات اور رسول صلعم کے فرمودات کو ذہن میں رکھیں تو در پردہ اس شعر میں "اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" میں "نیند" کے لفظ کو ذہن نشیں کرایا گیا ہے۔ صلوٰۃ یعنی نماز بیداری کی علامت ہے اور نیند (نَوْمٌ) غفلت کی۔

اِس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں روزہ کی اہمیت کا ذکر ہے جو مبنی ہے درج ذیل آیات پر :-

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کر دیئے گئے تھے۔ اِس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔" (سورۃ البقر ۲- آیت ۱۸۳)

یہ سب کچھ کہہ چکنے پر کہ جب اِن دو فرض عبادات، نماز اور روزہ کے معاملے میں مسلمانوں کی بے راہ روی اب مثالی بن گئی ہے اُن کا نظم "شکوہ" (تیرھواں بند) میں یہ کہنا کہ ؎

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں (دیکھیں ضمیمہ نمبر ۲)

اِس آئینِ وفاداری کی نفی کرتا ہے کیونکہ قرآن میں تو آئین وفاداری اِسے کہا گیا ہے کہ :-

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں، جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خُدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) : "پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ بس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا ہے اُسے درحقیقت بڑی ذلّت و رُسوائی میں ڈال دیا ہے، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا - مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سُنا جو ایمان کی طرف بُلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اُس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے میرے آقا، جو قصور ہم سے ہوئے ہیں اُن سے درگزر فرما، جو بُرائیاں ہم میں ہیں اُنہیں دُور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خُداوندا، جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رُسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے

والا نہیں ہے" ــــ (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۲۰)

اقبال نے مندرجہ بالا آیات کے پیشِ نظر "ضربِ کلیم" کی نظم "مدنیتِ اسلام" کے درج ذیل شعر میں اسی "آئین وفاداری" کو اس طرح بھی ذہن نشین کرایا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ اور کمالِ جنوں

دسواں بند

جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

اس بند میں اقبال مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی کی یاد دلا کر ایک طرف تو اُن میں ترغیب عمل کے رجحانات پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے مادہ پرستانہ نظریۂ حیات کی وجہ کر اُن کی اخلاقی گراوٹ کو اپنے ہدف کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ بند درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا رب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت والا بنا دیا۔ اور جب وہ اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہر گز نہیں۔ بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو" ــــ

(سورۃ الفجر ۸۹۔ رکوع ۱)

گیارھواں بند

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

اس بند میں اقبالؔ اُن اسلاف کے جذبۂ ایماں کی یاد دلاتے ہیں جنہوں نے اپنے اِسی جذبہ کی بدولت دُنیا سے باطل کو مٹایا، انسانوں کو آزادی عطا کی، خانۂ کعبہ اور اِس کی حُرمت کو دُنیا کی سب سے پہلی عبادت گاہ سمجھ کر اپنی جبینیں جُھکا کر اپنے جذبۂ ایمانی کا ثبوت دیا ہے۔ اور پھر قرآن پر وہ خود باعمل رہے اور دوسروں کو بھی اِس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔ اور آخری شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ یہ سارے اسلاف تو وہ ہیں جن کی تم اولاد ہو مگر گمراہی میں مُبتلا ہو کر تم میں عمل مفقود ہو گیا اور تم نے اُن کی اولاد ہوتے ہوئے اسلام کی کوئی خدمت نہ کی اور اُلٹے اپنی بدحالی پر خدا پر طعنہ زن ہو بیٹھے۔ اور اُسے موردِ الزام قرار دے ڈالا۔

اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے: "صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟" میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

"اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں اُن سے دِل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی؛ وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ اُن کی دُعا بس یہ تھی کہ: "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرما۔ ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما" — آخرکار اللہ نے اُن کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اُس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں"
— (سورۃ آل عمران ۳- رکوع ۱۵)

باطل کے آگے سرنگوں نہ ہونے کی یاد اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم "ترانۂ ملّی" کے اِس شعر میں بھی دلائی ہے ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

جہاں تک کعبے کو جبینوں سے بسانے کا سوال ہے اس مکرم عبادت گاہ سے اہلِ ایمان کے تعلق پر فرمایا گیا ہے :

" جن لوگوں کو ہم نے کتاب (قرآن) دی ہے، وہ اِس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، مگر اُن میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۴۶)

اس بند کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے : "میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟ میں "کس نے؟" کہہ کر اقبالؔ نے مسلمانوں کو اُن اسلاف کے "ایمان" کی یاد دلائی ہے جو قرآن کو رُشد و ہدایت کا منبع و سرچشمہ جانتے تھے۔ اور جنہوں نے اُسے اپنا ضابطۂ حیات بنا لیا تھا۔ اِس مصرعہ کو گرفت میں لانے کے لئے اور اقبالؔ، قرآن کے نزول کی مقصدیت کے تحت، کن نکتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں اور اِس سے مُنھ موڑنے والوں کا انجام بد کیا ہوگا درج ذیل آیات کا مطالعہ ضروری ہے۔

" ط۔ س۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مُبین کی، ہدایت اور بشارت اُن ایمان لانے والوں کے لئے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے اُن کے لئے ہم نے اُن کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیا ہے، اِس لئے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔" ــــ (سورۃ النمل ۲۷۔ رکوع ۱)

" اے محمدؐ ...... اور ہم نے خاص اپنے یاں سے تم کو ایک ذکر (درسِ نصیحت یعنی قرآن) عطا کیا ہے۔ جو کوئی اِس سے منھ موڑے گا وہ قیامت کے روز سخت بارِ گناہ اُٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے اور قیامت کے دِن اُن کے لئے (اِس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ) بڑا

تکلیف دہ بوجھ ہوگا" ۔۔۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۵)

" اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہمرنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اُسے سُن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر اُن کے جسم اور اُن کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں"۔

۔۔۔ (سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۳)

" اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے" ۔۔۔ (سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۶)

اِن آیات میں ہمیں اقبالؔ کے اِس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ وہ کون تھے جنہوں نے قرآن کو اپنے سینوں سے لگایا اور اُسے سینہ سے لگانے کی وجہ کیا تھی اور وہ وجہ تھی صرف اللہ ہی پر ایمان نہیں بلکہ آخرت پر بھی ایمان۔ اور یہی نکتہ اقبالؔ اِس مصرعہ میں ذہن نشیں کراتے ہیں۔

اِس بند کے آخری شعر میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی کو اپنے طنز کا نشانہ بنا کر درج ذیل آیات ذہن نشیں کرایا ہے :۔

" حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ) اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے" ۔۔۔ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۲)

" اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے (وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی) اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائیگی، پھر اُس کی پوری پوری اجر اُس کو دی جائے گی"۔ (سورۃ النجم ۵۳۔ رکوع ۳)

اِس بند کے اِس آخری شعر کے دوسرے مصرعہ پر اقبالؔ نے ذرا اور بھی زیادہ حکیمانہ طریقے سے "ضربِ کلیم" کی نظم : "آج اور کل" میں سورۃ الرعد ۱۳ کے مندرجہ بالا رکوع ۲ کی آیات کو ذہن نشیں

کرایا ہے :-

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے!
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

انہی آیات کے حوالے سے اقبال نے مندرجہ بالا نظم کی تشریح اپنے فارسی کلام: "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے جس سے: "ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو" کے مصرعہ کو گرفت میں لانا آسان ہو جاتا ہے :-

"کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن حکیم نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی کی صلاحیت پیدا نہ کرے) کے سادہ مگر بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے"۔

بارھواں بند

کیا کہا، بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

اِس بند کا پہلا شعر نظم: "شکوہ" کے سولھویں بند کے اِس شعر کے جواب میں ہے کہ ؎

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اس بند کے پہلے شعر میں" کیا کہا ؟" کہہ کر اقبالؔ نے مسلمانوں کے دعوٰی ایمان پر کاری ضرب لگائی ہے جو زبان سے تو اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اُس کی بھیجی ہوئی کتاب اور اُس کتاب میں جزا اور سزا کے اصولوں پر ایمان کی باتیں کرتے ہیں مگر یہ ایمان اُن کے دلوں جا گزیں نہیں ہے ورنہ ایسے غیر شعوری اور بیجا شکوے اُن کے منہ سے نہ نکلتے۔ نظم "شکوہ" کے اُن نقروں کا کہ" کافر کو ملیں حور و قصور" اور بیچارے مسلمانوں کو فقط وعدۂ حور" اقبالؔ نے جواب "کیا کہا؟" سے شروع کر کے روزِ حشر جزا اور سزا کے اُن اُصولوں کی یاد دلائی ہے جن سے لاعلم ہونے پر استفہامیہ انداز میں تعجب کا اظہار کیا گیا ہے اور جواب بھی استفہامیہ انداز ہی میں دیا گیا ہے کہ :۔

"تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی زندگی کا سامان اور اُس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اِس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ؛ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے پانے والا ہو کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سرو سامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لئے پیش کیا جانے والا ہو؟"

—— (سورۃ القصص ۲۸ ۔ رکوع ۶ اور ۷)

"جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دُنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے" —— (سورۃ الشوریٰ ۴۲ ۔ رکوع ۳)

" لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں ۔ کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا ؛ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ مقرر ہی کے لئے پیدا کیا ہے ۔ مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

—— (سورۃ الروم ۳۰ ۔ رکوع ۱)

اقبالؔ نے جزا اور سزا کے اصولوں کو مندرجہ بالا آیات کے پیشِ نظر "بالِ جبریل" کی غزل ۵ (جو لندن میں لکھی گئی) کے درجِ ذیل شعر میں اِس طرح بھی ذہن نشین کرایا ہے ؎

جس کا عمل ہے بے غرض اُس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادۂ و جام سے گذر!

اِس شعر میں "حور و خیام" کی تلمیح درج ذیل آیات سے ماخوذ ہے :-

"اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اِن نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوبصورت بیویاں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے! (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ) خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں (حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ)" ___ (سورۃ الرحمٰن ۵۵۔ رکوع ۳)

"حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ" کی تفسیر حدیث میں اِس طرح مروی ہے کہ:-

"حضرت عبداللہ ابن قیسؓ کا بیان ہے کہ رسول انورؐ نے فرمایا: "جنت میں ایک کھوکھلے موتی کا خیمہ ہوگا جس کا عرض ساٹھ میل کا ہوگا۔ اِس کے ایک گوشہ کے خُدّام دوسرے گوشہ کے خُدّاموں کو نظر آئیں گے۔ مومنین ان تمام چیزوں پر آیا جایا کریں گے" ___

(بحوالہ "تجرید صحیح بخاری شریف، اُردو" نمبر شمار ۱۲۷۱)

"وعدۂ حور" کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے :-

"متقی لوگ وہاں (جنت میں) باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، لُطف لے رہے ہوں گے اُن چیزوں سے جو اُن کا رب اُنہیں دے گا، اور اُن کا رب اُنہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔ (اِن سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں اُن سے بیاہ دیں گے۔" ___ (سورۃ الطور ۵۲۔ رکوع ۱)

یہ تھیں اب تک ساری باتیں اِس بارھویں بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ: "کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور" پر، اور وہ سارے قرآنی ارشادات جو اقبالؔ اِس مصرعہ میں "کیا کہا؟" کے طرزِ تخاطب سے ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں۔ اب اِسی شعر کا دوسرا مصرعہ: "شکوہ بیجا بھی کرے کوئی

تو لازم ہے شعور" درج ذیل آیات کا ترجمان ہے :-

" انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اُسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اُس پر پھول جاتا ہے ، اور اگر اُس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اُس پر اُلٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے" ۔

— (سورۃ الشوریٰ ۴۲ - رکوع ۵)

چونکہ اِس بند کے پہلے شعر میں خدائے تعالےٰ سے اُس کی ناانصافی کی شکایت کی گئی ہے اِس لئے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے : " عدل ہے خاطر ہستی کا ازل سے دستور" میں اقبال نے اُن پیمانوں کی یاد دلائی ہے جن پر دنیا اور آخرت دونوں میں جزا یا سزا منحصر ہے ۔ ایسی چند آیات درج ذیل ہیں :-

" جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے ۔ اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے ۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا ، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ، بشرطیکہ ہو وہ مومن ، اُسے ہم دُنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے" ۔

— (سورۃ النحل ۱۶ - رکوع ۱۳)

" پھر جو نیک عمل کرے گا ، اس حال میں کہ وہ مومن ہو ، تو اُس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی ، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں" — (سورۃ الانبیاء ۲۱ - آیت ۹۴)

" پھر جن لوگوں نے دعوتِ حق کو مانا اور نیک عمل کئے وہ خوش نصیب ہیں اور اُن کے لئے اچھا انجام ہے" — (سورۃ الرعد ۱۳ - آیت ۲۹)

" جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے ، اور جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے" ۔

— (سورۃ آلِ عمران ۳ - رکوع ۱۵)

" ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اُٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوتِ حق کا) کوئی انتقام وہ لیں، اور اُس کے بدلے اُن کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے یہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجرَ المُحسِنِینَ) اِسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہوگا کہ وہ (راہِ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اُٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور اُن کے حق میں اُسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ اُن کے اِس اچھے کارنامے کا صلہ اُنہیں عطا کرے"۔ — (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۵)

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے: "مسلم آئیں ہوا کافر، تو ملے حور و قصور" میں در پردہ چند ایسی آیات کو ذہن نشیں کرایا گیا ہے:-

" اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

— (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۹)

" ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا" (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۷)

اِس مصرعہ میں کہی گئی باتوں کو ہی اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۱۱ کے درج ذیل شعر میں اور بھی وضاحت سے پیش کیا ہے کہ ؎

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی!

نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اِس بند کا آخری شعر اور خصوصاً اِس کا دوسرا مصرعہ: "جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں" اتنا بلیغ ہے کہ اِس ناچیز کا قلم اقبال کے قرآنی تصوّرات کو صفحۂ قرطاس پر لانے یا اُس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہے۔ اب رہا نفسِ مضمون تو اسکی تب وتاب کا نفسِ مضمون کی مناسبت سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اقبال نے اس شعر میں

وہی باتیں دہرائی ہیں جو انہوں نے اسی نظم: "جوابِ شکوہ" کے چھٹے بند کے اس مصرعے: "کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں" میں کی ہیں اور عشقِ الٰہی کی گرویدگی کو یہ کہہ کر ضرب المثل بنا دیا کہ: "جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں"۔ یہ قصہ قرآن میں اس طرح وارد ہوا ہے :۔

"ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب ورروز کے لئے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مُدت پورے چالیس دن ہوگئی۔ موسیٰؑ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ: "میرے پیچھے تم میری قوم (بنی اسرائیل) میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا"۔ جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اُس کے رب نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے اِلتجا کی کہ: "اے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں" (قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ) ـــ فرمایا: "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا (قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ)۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا"۔ چنانچہ اُس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلّی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں" ـــ فرمایا: "اے موسیٰؑ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو (وَبِكَلَامِیْ) پس جو کچھ میں تجھے دوں اُسے لے اور شکر بجا لا" ـــ (سورۃ الاعراف۔ رکوع ۱۷)

اس نظم: "جوابِ شکوہ" کے پانچویں بند کے آخری شعر میں اگر اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ:۔ "ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے" تو اس کی مثال کہ بندے بھی خدا سے ہم کلام ہوئے ہیں کا ذکر مندرجہ بالا قرآنی قصہ میں وارد ہوا اور اس ہم کلامی کی مزید تشریح سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۶۴ میں بھی وارد ہوئی ہے کہ:۔

"ہم (خدا) نے موسیٰؑ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے (وَكَلَّمَ

اللّٰہُ مُوسیٰ تَکلِیماً ")۔

یہی وجہ ہے کہ اُردو، فارسی اور عربی زبانوں میں حضرت موسیٰؑ کو "کلیم اللہ" کے لقب سے نوازا گیا ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو "خلیل اللہ" کے لقب سے۔ جس کا جواز قرآن میں سورۃ النسآء ۴ ہی کی آیت ۱۲۵ سے فراہم ہوتا ہے :۔

" اس شخص سے بہتر اور کس کا طریقِ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اس ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا (وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبرَاھِیمَ خَلِیلاً)۔

تیرہواں بند

مَنفَعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مجموعی طور پر اس پورے بند میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :۔

" پس (اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اُس سے، اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ اُن مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اُسی میں وہ مگن ہے"

—— (سورۃ الروم ۳۰۔ رکوع ۱)

"اب اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اُسی پر چلو اور اُن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔" ـــــ (سورۃ الجاثیہ ۴۵۔ رکوع ۲)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ، اللہ پر اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کرچکا ہے۔ جس نے اللہ اور اُس کے ملائکہ اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کُفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔"

ـــــ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۰)

اِس بند میں چونکہ اجتماعیت اور مرکزیت دونوں کی باتیں کہی گئی ہیں اِس لئے اقبال نے اِس بند کے اشعار میں چند ایسی باتوں کا، جو جزوِ ایمان ہیں، مصلحتاً ذِکر کیا ہے۔ جیسے حرم پاک جس کی اجتماعیت اور مرکزیت دونوں کے متعلق ارشاد ہے :۔

"اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے حالات سے باخبر ہے اور اُسے ہر چیز کا علم ہے" ـــــ (سورۃ المائدہ ۵۔ آیت ۹۷)

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اِس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اُس میں کُھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اور اُس کا حال یہ ہے کہ جو اِس میں داخل ہوا مامون ہوگیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اِس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ

اِس کا حج کرے، اور جو کوئی اِس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تمام دُنیا والوں سے بے نیاز ہے"

—— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۰)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اِس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو، اور لوگوں کو حج کے لئے اِذنِ عام دیدو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں، تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لئے رکھے گئے ہیں، اور چند مقرّر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُنھیں بخشے ہیں، خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں، پھر اپنا مَیل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حُرمتوں کا احترام کرے تو یہ اُس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لئے بہتر ہے"۔ —— (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۴)

اقبال نے "حرمِ پاک" کی اِسی حُرمت اور اِس کی تعمیر کی اِسی مقصدیت کو "بانگِ درا" کی نظم: "ترانۂ ملّی" کے درجِ ذیل شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے جس کے پہلے مصرعہ میں سورۃ آلِ عمران ۳ کے رکوع ۱۰ کی مندرجہ بالا آیات میں درج سب سے پہلی آیت: "بے شک سب سے پہلی عبادت جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے" کی ہو بہو تلمیح کی گئی ہے اور دوسرے مصرعہ میں سورۃ الحج ۲۲ کے رکوع ۴ کی مندرجہ بالا آیات میں اِس آیت: "کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو" کی تلمیح کی گئی ہے ؎

دُنیا کے بُت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

"اللہ بھی ایک" پر تو قرآن میں اَن گنت آیات وارد ہوئی ہیں نفسِ شعر کی خاطر صرف سورۃ البقرہ ۲ کے رکوع ۱۹ اور ۲۰ کی آیات درج کی جا رہی ہیں :۔ جن میں ایک ہی خدا ہونے کی توجیہہ اور اُس کے دلائل بھی فرمائی گئی ہیں :۔

"تمہارا خُدا ایک ہی خُدا ہے' اُس رحمان اور رحیم کے سوا کوئی خدا نہیں ہے (وَ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ)۔ (اِس حقیقت کو پہچاننے کے لئے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اُس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اِسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کے جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں' اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمانبردار بنا کر رکھے گئے ہیں' بے شمار نشانیاں ہیں۔"

"قرآن بھی ایک" پر، طوالت کو ملحوظ رکھ کر، صرف سورۃ فاطر ۳۵ کی آیت ۳۱ ذیل میں درج کی جا رہی ہے :۔

"(اے نبیؐ، جو کتاب (قرآن) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے اُن کتابوں کی جو اُس سے پہلے آئی تھیں۔ بیشک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے"۔

نظم "جوابِ شکوہ" طنزیہ نظم ہے جس میں اقبالؔ مسلمانوں کی دین سے بیگانگی کے ہر پہلو کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا ذکر لا کر وہ در پردہ یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جس نعمتِ اعظمیٰ کی وراثت تمہیں سونپی گئی تھی اُس کی ذمہ داریوں سے تو تم نے منہ پھیر لیا اور اُلٹے اپنی خستہ حالی پر خُدا سے شکوہ کر بیٹھے۔ قرآن کی وراثت مومنوں کو سونپے جانے کے متعلق

ارشاد ہے :۔

"پھر ہم نے اِس کتاب (قرآن) کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنہیں ہم نے (اِس وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ اب کوئی تو اِن میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اِذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے۔..... اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اُن کے لئے جہنّم کی آگ ہے۔ نہ اُن کا قصہ پاک کر دیا جائیگا کہ مر جائیں اور نہ اُن کے لئے جہنّم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو"۔

—— (سورۃ فاطر ۳۵۔ رکوع ۴)

اقبالؔ نے مسلمانوں کی جس وراثت کی یاد دلائی ہے اُسے انہوں نے "بانگِ درا" کی نظم "شمع اور شاعر" میں، جو فروری ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی، امانت کا نام دے کر کہا ہے ؎

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا،
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

"دین بھی ایک" کے متعلق ارشاد ہے :۔

"اُس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

—— (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

"یہ تمہاری (رسول صلعم کی) اُمت حقیقت میں ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) اُنہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"۔

—— (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۶)

اس بند کا آخری شعر درج ذیل آیات پر دلالت کرتا ہے :۔

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو (وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا) اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اُس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دِل جوڑ دیئے اور اُس کے فضل وکرم سے تم بھائی بھائی بن گئے تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اِس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے پیش کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔ — (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۱)

" کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔ جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز (روزِ حشر) سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سُرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہوگا" — (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۱۱)

" لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اِس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آچکا تھا، اور اِس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو اُن کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب (قرآن) کے وارث بنائے گئے وہ اُس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں" — (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۴)

چودھواں بند

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ؟ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار ؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں اقبال نے درجِ ذیل آیات کی یاد دلائی ہے :-

" پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی رسول اللہؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اُس کی نافرمانی کرتے رہے تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔" (سورۃ النساء ۴ - رکوع ۶)

" اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔"

— (سورۃ النساء ۴ - آیت ۶۵)

" اے محمدؐ، ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو مُنہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں اُن لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے" — (سورۃ النساء ۴ - رکوع ۱۱)

" درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ (اُسوۂ حسنہ) تھا، ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے" — (سورۃ الاحزاب ۳۳ - آیت ۲۱)

" درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود اُنہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اُس کی آیات اُنہیں سُناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے ،

حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے"

— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۶۴)

اِس بند کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ: "مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟" میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

" انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اُس کی مُصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اُس نے کبھی اپنے کسی بُرے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اِس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لئے اُن کے کرتوت خوشنما دیئے گئے ہیں۔" — (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۱۲)

" لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم اُن کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ اِن سے کہو: "اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے، اُس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔

— (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۲۱)

" اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ"

— (سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۱۱)

" اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اُس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اُس پر آئی تھی ہم اُسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اِس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے

اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لئے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"

— (سورۃ ھود ۱۱ - رکوع ۲)

"تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اُسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اُس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اِس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے، تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا، مزے کرلو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائیگا۔"

— (سورۃ النحل ۱۶ - رکوع ۷)

اس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "شعارِ اغیار" کہہ کر اقبال نے "شعائر اللہ" کی یاد دلائی ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خُدا پرستی کی نشانیوں کو بے حُرمت نہ کرو

(يَآاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَآئِرَ اللّٰهِ)"

— (سورۃُ المائدۃ ۵ - رکوع ۱)

"شعار" سے مُراد طرزِ فکر و عمل ہے اور "شعائر اللہ" سے مُراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر و دہریت کے بالمقابل خالص خُدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ "شعائر اللہ" کو چھوڑ کر "شعارِ اغیار" اپنانے والوں کو اقبال درجِ ذیل آیات ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں :-

"اس شخص سے بہتر اور کس کا طریقِ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویّہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔"

(سورۃ النساء ۴ - رکوع ۱۸)

"تم جس روش پر بھی ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اُس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ اُنہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"

— (سورۃ النور ۲۴ - رکوع ۹)

اس بند کے آخری شعر میں اقبال نے اتباعِ رسول ﷺ کی تلقین کی ہے اور ایسی چند آیات درج ذیل ہیں:-

"مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا، جو قصور ہم سے ہوئے ہیں اُن سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر"

— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اُس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اُسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے"

— (سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اُس سے سرتابی نہ کرو۔ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا۔ (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ اُن کو سنواتا تو وہ بے رُخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے"۔

— (سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۳)

پندرھواں بند

جلکے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غربا کے دم سے

اِس بند میں "نشۂ دولت" میں خُدا سے غافل ہو جانے اور ایسے کافرِ نعمت لوگوں کے "ملّتِ بیضا" پر بدنما داغ بن جانے ہی کو اقبالؒ نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور انہی باتوں پر درجِ ذیل آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے :-

"یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے" ـــــ (سورۃ النساء ۴ ـ رکوع ۶)

"اے نبیؐ، اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں" ـــــ (سورۃ الاعراف ۷ ـ رکوع ۲۴)

"جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اُس پر تم دِل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اُس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں (وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ)"

ـــــ (سورۃ الحدید ۵۷ ـ آیت ۲۳)

لوگو، تمہاری یہ بغاوت (حق سے انحراف) تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دُنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو)، پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور اُن کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم اِن سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اُسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اِس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اِس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور

اللہ تمہیں دارالسّلام کی طرف دعوت دے رہا ہے (وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى
دَارِ السَّلٰمِ) (ہدایت اُس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے
سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے"۔ — (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۳)

" تمہارا رب کہتا ہے : مجھے پکارو، میں تمہاری دُعائیں قبول کروں گا، جو لوگ
گھمنڈ میں آکر ہماری عبادت سے مُنہ موڑتے ہیں۔ ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم
میں داخل ہوں گے" — (سورۃ المومن ۴۰۔ آیت ۶۰)

یہ تھیں چند آیات جن کے پسِ منظر میں اِس پورے پندرھویں بند کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس بند کا آخری شعر، اِس بند میں مجموعی طور پر ایمان کے معاملے میں امیر اور غریب دونوں کے ایمان کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور پہلے دو اشعار میں یہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں خدا نے سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر اور امیروں کو دولت اور عزت کے گھمنڈ میں آکر اللہ اور اُس کے رسولؐ سے منہ موڑنے والوں کو آزمائش میں ڈال دیا حالانکہ موخر الذکر بھی دعویٰ ایمان کرتے ہیں۔ اِس تقابلی تجزیہ پر درج ذیل آیات پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں اور پہلے دو اشعار گرفت میں لائے جا سکتے ہیں:

" اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اُس کی خوشنودی
کی طلب میں لگے ہوئے ہیں اُنھیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ اُن کے حساب میں
سے کسی چیز کا بار تُم (رسول اللّٰہ) پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی
چیز کا بار اُن پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تُم (رسول اللّٰہ) اُنہیں دور پھینکو گے تو
ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اِس طرح اِن لوگوں میں سے بعض کو
بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ اُنہیں دیکھ کر کہیں : " کیا یہ
ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللّٰہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟" ہاں کیا خدا اپنے
شکر گذار بندوں کو اِن سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟"

— (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۶)

سولہواں بند

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　　برقِ طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی　　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

اس بند کے پہلے شعر میں قوم و ملّت میں ایسے لوگوں کے نہ ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہے کہ :-

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں، جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے"۔ ـــــ (سورۃ آلِ عمران ۳- رکوع ۱۱)

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں مسلمانوں پر طنز کیا ہے کہ اذان تو اب بھی ہوتی ہے مگر اس میں "روحِ بلالی" نہیں پائی جاتی۔ یعنی وہ خلوص اور دین کی خاطر وہ ساری صعوبتیں جھیلنے کا جذبہ نہیں پایا جاتا جو حضرت بلالؓ کا طرۂ امتیاز تھا اور جنہوں نے رسول اللہ کے مدنی دور میں مسجدِ نبوی کے موذن ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اقبالؔ نے ایسے تو اپنے اردو کلام کے منفرد اشعار میں بہت سارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حضور اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ مگر انہوں نے خصوصی نظمیں صرف دو پر رقم کی ہیں یعنی ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسری حضرت بلال بن رباحؓ پر۔ اور اقبالؔ نے اول الذکر کی جانی قربانیوں کے ساتھ آپؓ کی مالی قربانیوں کو مثالی قرار دیا ہے اور موخر الذکر کی جانی قربانیوں کو مثالی بتایا ہے۔ وہ حضرت بلال کی جانی قربانیوں سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہوں نے آپؓ پر دو نظمیں لکھیں اور یہ تینوں نظمیں اُن کے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ حضرت بلالؓ کو حضرت بلال حبشیؓ بھی کہا جاتا ہے اِس لئے کہ وہ ملک حبش کے رہنے والے تھے اور رسول اللہ کی پکار پر لبیک کہتے مکہ تشریف لائے تھے۔ حبش اُس ملک کو کہتے ہیں جسے دوسری جنگِ عظیم ۴۵-۱۹۳۹ء کے قبل "ابی سینا" کہتے تھے اور جنگ کے بعد اُسے اب "ایتھوپیا" کہا جاتا ہے جہاں حکومت

اور اکثریت تو عیسائیوں کی ہے مگر مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔ اور اِس ملک کے ایک خطّے (جسے "ایری ٹیریا" کہا جاتا ہے) کی خود مختاری حاصل کرنے کے لئے پچھلے چالیس سالوں سے وہ لاکھوں کی تعداد میں جانی قربانیاں دے چکے ہیں اس لئے کہ اِس خطّے میں وہ اکثریت میں ہیں۔ یہ ملک برّاعظم افریقہ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ جب مکّہ میں ایمان لانے والوں پر مُنکرین اور مشرکین نے زندگی تنگ کر دی تھی تو حضور صلعم کی ایماء پر بہت سارے مسلمانوں نے حبش کو ہجرت کی اور یہ ہجرت کا پہلا واقعہ تھا۔ اُس وقت بھی حبش کا فرمانروا عیسائی تھا جسے تاریخ میں نجاشی کے لقب سے پُکارا جاتا ہے۔

اِس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "روحِ بلالی" سے اقبال کی مُراد عشقِ رسولؐ میں گرویدگی ہے۔ جس پر ایک مومن اپنے ایمان کی عمارت سورۃ آلِ عمران ۳۔ کی آیات ۳۱ اور ۳۲ کے تحت کھڑی کرتا ہے۔ مکّہ میں سب سے پہلے آپ کی دعوت پر ایمان لانے والے کل سات حضرات تھے جن میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ شامل ہیں۔ حضرت بلالؓ کے ایمان لانے پر مکّہ کے مُنکرین اور مشرکین نے اُن رضؓ کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ تاریخِ اسلام کا ایک دردناک باب ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے آپؓ پر دو نظمیں لکھیں۔ دانش بک ڈپو۔ ٹانڈہ (فیض آباد) نے میرے ایسے ہی مضامین کا ایک مجموعہ جنوری ۱۹۸۹ء میں شائع کیا ہے جو ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اُس کا نام "رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی" ہے کیوں کہ اس میں ایک مضمون کا عنوان ہی یہی ہے۔

حضرت بلالؓ چونکہ حبش کے باشندہ تھے جہاں کے لوگ عموماً سیاہ فام ہوتے ہیں اِس لئے اقبالؔ نے آپؓ پر لکھی گئی پہلی نظم میں اُس کی تلمیح درجِ ذیل شعر میں جس طرح کی ہے اُس سے بہتر نذرانۂ عقیدت دو چھوٹے مصرعوں میں پیش نہیں کی جا سکتی جس میں حضرت موسیٰؑ کے "یدِ بیضا" بھی تلمیح کے طور پر شامل ہے کہتے ہیں ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر

اور پھر حضرت بلالؓ ہی پر اقبالؔ کی دوسری نظم کے اِس آخری شعر کو دیکھئے ؎

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے

رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے

اِس دوامیت کا ثبوت آج بھی مدینہ منوّرہ کی مسجد نبویؐ میں موجود ہے جہاں آپؓ جس اونچے چبوترے پر اذان کا فریضہ انجام دیتے تھے اُس مقام پر قدِ آدم اونچا ایک بڑا چوکور چبوترہ مسجد کے اندر ہے اور اُس کی بائیں جانب ذرا آگے کی طرف وہ محراب بھی موجود ہے جہاں آپؐ امامت کا فرض ادا فرماتے تھے۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے ؛ "فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی" میں بھی اقبالؔ مسلمانوں پر طنز کرتے ہیں کہ مسلمان منطق اور فلسفہ تو پڑھتے ہیں مگر امام غزالیؒ کے فلسفہ سے واقفیت نہیں رکھتے جو بحیثیت مجموعی یعنی سیرت اور زہد و اتقار کے اعتبار سے اور علم و فضل میں یگانہ دیکھتے تھے۔ امام غزالیؒ ۱۰۵۸ھ میں بمقام طوس واقع صوبہ خُراسان پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی مشہور تصانیف "کیمیائے سعادت" "معارج القدس" "مشکوٰۃ الانوار" "احیاء العلوم" ہیں۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کے دعویٰ ایمان پر کاری ضرب لگاتے ہیں اور اُن پر تُف کرتے ہیں کہ تمہارے اِس دعویٰ کا ثبوت تو مسجدیں دے رہی ہیں جو نمازیوں کے موجود نہ ہونے پر گریہ کناں ہیں۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ کو نویں بند کے پہلے شعر پر مندرج قرآنی آیات کے ساتھ پڑھا جائے تو اقبالؔ جس نکتہ کو ذہن نشیں کراتے ہیں وہ واضح ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ نے مسلمانوں کی نماز سے بے تعلقی پر اُنہیں بار بار اپنے کلام میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ "بانگِ درا" کی نظم "شمع اور شاعر" میں کہتے ہیں ؎

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی\
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

اِسی موضوع "نماز" پر اقبالؔ اپنی اخیر عمر میں ذرا سنجیدگی کے ساتھ اپنے مخصوص فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بے نمازیوں پر "ضربِ کلیم" کی نظم : "نماز" میں اس طرح طنز کرتے ہیں :-

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں\
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات\
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

اِس بند کے اِس آخری شعر میں مسجدوں کی مرثیہ خوانی کی وجہ "اوصافِ حجازی" کا نہ ہونا قرار دی گئی ہے۔ اس سے مُراد ایمان کی وہ پختگی اور عشقِ رسولؐ میں وہ گرویدگی ہے جو صحابۂ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے اوصاف تھے۔ حجاز موجودہ سعودی عربیہ کے اُس خطہ کو کہتے ہیں جس میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف اور وہ علاقے جو درمیان نجد ہیں شامل ہیں۔

سترہواں بند

شور ہے، ہو گئے دُنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود!
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اِس بند میں اقبال نے نظم "شکوہ" (دیکھیں ضمیمہ نمبر ۲) کے درجِ ذیل پندرہویں بند کا جواب دیا ہے:-

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے　　ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حُدی خوان گئے　　اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کُفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

نظم "جوابِ شکوہ" کے اِس سترہویں بند کے پہلے دو اشعار میں اقبال نے عام مسلمانوں کے دعویٰ ایمان پر ایسا بھرپور وار کیا ہے جس کی مدافعت اگر آج سے ۵۰ سال قبل ممکن نہ تھی تو آج تو اور بھی ممکن نہیں۔ اِس بند کا آخری شعر درجِ ذیل آیات کا ترجمان ہے۔

"جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً اُن سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں، اُن کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی اُن کو بتائے گا کہ اُنہوں نے کیا کچھ کیا ہے" ——— (سورۃ الانعام ۶- رکوع ۲۰)

"یہ تمہاری (رسول صلعم کی) اُمت حقیقت میں ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔"

— (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۶)

اٹھارہواں بند

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک　　عدل اُس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک　　تھا شجاعت میں وہ اک ہستیٔ فوق الادراک

خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبائش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینائش بود

اِس نظم کے زیادہ تر بندوں میں اقبالؔ نے اسلاف سے نسبت روحانی مفقود ہو جانے ہی کی باتیں کی ہیں اور اِس نکتہ کو مختلف بندوں میں مختلف طریقوں سے ذہن نشیں کرایا ہے۔ اس بند میں اُن کی بیباک صداقت، اُن کا بے لوث عدل، اُن کی حیا اور بے مثال شجاعت جیسے اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے پہلے شعر میں درجِ ذیل آیات کی یاد دلائی گئی ہے:۔

"اے لوگو جو ایمان لائے، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

— (سورۃ المائدہ ۵۔ آیت ۸)

"اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔"

— (سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۹)

"اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو"

— (سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۹۰)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو درجِ ذیل آیات کی روشنی میں پڑھا جاسکتا ہے :۔

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیرخواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے "۔

—— (سورۃ النساء ۴، آیت ۱۳۵)

اِس بند کے دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ درجِ ذیل آیت کا ترجمان ہے :۔

" اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کُھلی ہوں یا چُھپی "۔

—— (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۱۹)

اُمتِ محمدیؐ کو "خیرِ اُمت" کا شرف عطا کئے جانے کے پیشِ نظر اقبالؔ نے " بانگِ درا " کی نظم " طلوعِ اسلام " میں خطیبانہ انداز میں اِسی بند کے اہم نکتے یعنی صداقت، عدالت اور شجاعت کو اِس طرح ذہن نشین کرایا ہے ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اُنیسواں بند

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا　　اُس کے آئینۂ ہستی میں عملِ جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر، اُس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!

اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ درجِ ذیل آیات کا ترجمان ہے :۔

" اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گذر چکے ہیں، جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے

جنگ کی ..... اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں اُن سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، اُنھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے" ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۴۶)

پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اعمال ہی کو آئینۂ ہستی میں جزاء و سزا کا جوہر قرار دیا ہے جو مبنی ہے درج ذیل آیات پر:-

"یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے، جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے اُن کے عمل کی دُہری جزا ہے، اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔

ــــ (سورۃ سبا ۳۴۔ آیت ۳۷)

واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں" ــــ (سورۃ الکہف ۱۸۔ رکوع ۱)

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ درج ذیل آیت کا ترجمان ہے :-

" اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اُس کی راہ میں اِس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔

ــــ (سورۃ الصف ۶۱۔ آیت ۴)

دوسرے مصرعہ میں اِن آیات کی یاد دلائی گئی ہے :-

" کوئی ذی روح اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے"

ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۵)

" ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے۔ فرمانروائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"

ــــ (سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۹)

" اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے

حصہ میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔" ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۷)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے اُنہیں مُردہ نہ سمجھو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے اُنہیں دیا ہے اُس پر خوش و خرّم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان اُن کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں اُن کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے نام اور اُس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور اُن کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۷)

"دراصل مارنے اور جِلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے"

ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۷)

"اے نبیؐ، اِن سے کہو، "اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لئے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔" اِن سے کہو: "کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اُس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں" ــــ (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۲)

"ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔"

ــــ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۵۷)

"اور اے نبیؐ، ہمیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لئے نہیں رکھی ہے۔ اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخرکار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے" ــــ (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۳)

اِس بند کے آخری شعر میں باپ کے بعد بیٹے کو وراثت کا مستحق ہونے کے لئے اپنے

باپ کی صفات کو صرف زبانی ہی یاد رکھنے کو ہی نہیں بلکہ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ جن سے اقبالؔ کی مُراد مسلمانوں کو اُن صفات کی یاد دلانی ہے جو ایک مومن کی شان کے سلسلے میں قرآن میں جا بجا مذکور ہیں۔ اور جنہیں اُنہوں نے اِس بند کے پہلے دو اشعار کے الگ الگ مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ یہ آخری شعر درج ذیل آیت سے ماخوذ ہے:۔

"جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں اُن کے نقشِ قدم پر چلی ہے انکی اُس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی گھاٹا اُن کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے"

— (سورۃ الطور ۵۲۔ آیت ۲۱)

بیسواں بند

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں 'تن آساں لوگوں کے متعلق اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت' اور وہ ہیں کہ غفلت میں مُنہ موڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس جو تازہ نصیحت بھی اُن کے رب کی طرف سے آتی ہے اُس کو بے تکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ دِل اُن کے (دوسری ہی فکروں میں منہمک ہیں" — (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۱)

"مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔

اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنیوالا اور رحم فرمانے والا ہے" ——— (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۳)

اِس پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "اندازِ مسلمانی" (جو اتباعِ رسولؐ کے مترادف ہے) کی وضاحت درجِ ذیل آیات میں ملتی ہے اور اقبال انہی باتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں :-

"کہو: اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَةَ اللّٰهِ) اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً)، اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں" ——— (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۳۸)

"(اے نبیؐ) ان سے کہو: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اُس کی بندگی کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں"۔ کہو: "اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے"۔ کہہ دو کہ: "میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو"۔

——— (سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۲)

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں" ——— (سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱۔ آیت ۳۳)

"تم جب دیکھو گے تو انہیں (جو رسول اللہ کے ساتھ ہیں) رکوع و سجود، اور اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات (یعنی خدا ترسی، کریم النفسی، شرافت اور حُسنِ اخلاق) اُن کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں" ——— (سورۃ الفتح ۴۸۔ رکوع ۴)

"لعنت ہو انسان پر کیسا سخت مُنکرِ حق ہے یہ ..... ہرگز نہیں، اس لئے کہ وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اُسے حکم دیا تھا"

——— (سورۃ عبس ۸۰۔ رکوع ۱)

اِس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "حیدری فقر" کہہ کر حضرت علیؓ کی شانِ فقر اور "دولت عثمانی" کہہ کر حضرت عثمانؓ کی سی "دولت" کی یاد دلائی ہے۔ "حیدر" حضرت علیؓ کا لقب تھا۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبالؔ کی مُراد ایسے مومن ہیں جن کے اوصاف کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

"سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

—(سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۱)

اِس بند کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ اسلاف سے جس "نسبت روحانی" پیدا کئے جانے کی تلقین کرتے ہیں وہ درج ذیل آیات پر مبنی ہیں جنہیں وہ ذہن نشین کراتے ہیں:۔

"اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ: "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ اس واقعہ نے اُن کے ایمان اور اُن کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ اُن میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انہوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ —— (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۳)

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنّت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گذریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ — (اُس وقت اُنہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے"۔ —

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۱۴)

اس بند کے آخری شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کو در پردہ قرآن کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پہلے مصرعہ میں وہ اسلاف کے معزز ہونے کی وجہ اُن کا صحیح معنوں میں ' قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر' مسلمان ہونا بتلاتے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں "تارکِ قرآں" یعنی قرآن سے منہ موڑ لینے کی وجہ کو ہی اُن کا ذلیل و خوار ہو جانا قرار دیتے ہیں۔ "تارکِ قرآں" کے طنز سے اقبالؔ قرآن کی افادیت اور فضیلت ذہن نشیں کراتے ہیں جن پر چند آیات درج ذیل ہیں :-

" اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اُس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ اُن سے منھ پھیر لے۔ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے" ——— (سورۃ السجدہ ۳۲۔ آیت ۲۲)

" ہم اُن کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے مُنہ موڑ رہے ہیں"

——— (سورہ المومنون ۲۳۔ رکوع ۴)۔

" لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اُسے قبول کر لیں اُن کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ کہو کہ " یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اُس نے بھیجی۔ اُس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیئے' یہ اُن سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں" ——— (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۶)

" تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اِذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا ہے"

(سورۃ المائدۃ ۵۔ رکوع ۳

اس آخری شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ جس "مسلمان" کا تصور پیش کرتے ہیں اُس کی وضاحت اُنہوں نے "ضربِ کلیم" کی نظم "مردِ مسلماں" میں کی ہے جس کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں :-

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں !

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کے تحت اسکے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!
فطرت کا سرودِ ازلی اسکے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!

اِس بند کے آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں در پردہ اقبال مسلمانوں کو "حقیقت میں قرآن" بن جانے کی صلاح دیتے ہیں کیونکہ "اندازِ مسلمانی" اِسی کا دوسرا نام ہے۔ انہی تصوّرات کو اقبال نے "ضربِ کلیم" ہی کی نظم: "اشتراکیت" میں اِس شعر میں بھی ذہن نشیں کرایا ہے ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

اکیسواں بند

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطاکار و خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم!
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا، سریرِ کَے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کا یہ ٹکڑا "تم ہو آپس میں غضبناک" درجِ ذیل آیات کی طرف دھیان مبذول کراتا ہے:-

"اللہ اِس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے" (سورۃُ النساء ۴۔ آیت ۱۴۸)

"اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ")

— (سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۴۶)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں (وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ) پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔ (سورۃُ النساء ۴۔ آیت ۵۹)

"اور اے نبیؐ، میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالیں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"

—— (سورۃ۔ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۵۳)

(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں اِن کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں"۔

—— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۵۹)

اقبال نے سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۵۹ کے مندرجہ بالا فقرے: "یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگِ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے" کی تلمیح "بالِ جبریل" کی غزل ۱۱ میں اس طرح کی ہے:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مُغاں ہے مردِ خلیق

اقبال نے اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے میں اگر مسلمانوں پر یہ طنز کیا ہے کہ: "تم ہو آپس میں غضبناک" تو وہ "بالِ جبریل" کے مندرجہ بالا شعر میں اُسی نکتہ کو سنجیدگی سے ذہن نشین کراتے ہیں کہ جس طرح پیرِ مُغاں کا خلق، شراب نوشوں کے لئے باعثِ کشش ہوتا ہے اُسی طرح معاشرہ

میں ہر شخص کو صاحبِ خلق ہونا ضروری ہے ورنہ صحت مند معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ اقبال نے اس شعر میں رسول اللہ کا اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ رکھنے کی یاد دلائی ہے کیونکہ اگر آپ درشت کلام اور غضبناک ہوتے یا سنگدل ہوتے تو وہ لوگ آپؐ کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اس لئے حضور اللہؐ کے جانشین ہونے کی وجہ کر ہر مسلمان کو عوام الناس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنا چاہیئے تاکہ لوگ اپنی قوم کے علماء، واعظین اور صاحب امر لوگوں کے گرد ویسا ہی ہجوم دیکھیں جو ہجوم صحابہ کرامؓ کا آپؐ کے گرد رہا کرتا تھا صرف اس لئے کہ: "پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق"۔

اس اکیسویں بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرع کے دوسرے ٹکڑے: وہ آپس میں رحیم" میں لفظ "وہ" سے مراد اسلاف ہیں جن کے اوصاف حمیدہ کی تقلید سے محرومی ہی کو مسلمانوں کے زوال کی وجہ اس پوری نظم "جوابِ شکوہ" میں مختلف طریقوں سے ذہن نشیں کرائی گئی ہے۔ "آپس میں رحیم" ہونے کے متعلق ارشاد ہے:۔

"اے نبیؐ، نرمی اور درگذر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کئے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو" — (سورۃ الاعراف، آیت ۱۹۹)

"بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو" — (سورہ المائدۃ ۵۔ رکوع ۷)

"صحیح بخاری شریف" اور "مسلم" میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ:

"تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملے میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے۔"

اس بند کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں "خطا بیں" اور "خطا پوش" کی تراکیب درجِ ذیل آیات کی ترجمان ہیں: "خطا بینی" پر حکم ربانی ہے:۔

"آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بُری بات ہے۔

جو لوگ اِس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں" ــــ (سورۃ الحجرات ۴۹ - رکوع ۲)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسّس نہ کرو (وَلَا تَجَسَّسُوْا)"

ــــ (سورۃ الحجرات ۴۹ - رکوع ۲)

کسی بھی غیر صحت مند معاشرہ میں ایک دوسرے کی خطابینی ہی اُسے لے ڈوبتی ہے۔ ہر فرد اپنی آنکھ کی شہتیر نہیں دیکھتا مگر دوسروں کی آنکھوں میں اُسے تِل نظر آتا رہتا ہے۔ اقبالؔ نے "تم خطاکار وخطابیں" کہہ کر مندرجہ بالا آیات اور اُن ساری روایات کی یاد دلائی ہے جن کے شرے میں: تحتِ فغفور بھی اُن کا تھا اور سریرِ کے بھی" ــــ " وَلَا تَجَسَّسُوْا " سے دوسروں کی خفیہ باتوں کو خواہ وہ گناہ ہی کیوں نہ ہو پتہ لگانے اور اُس کی جستجو میں لگے رہنے کو منع فرمایا گیا ہے۔ یہ شرعاً ممنوع ہے۔ روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

" اے لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو مگر ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اُترا ہے مسلمانوں کی پوشیدہ حالات کی کھوج نہ لگایا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب ڈھونڈنے کے درپئے ہوگا اللہ اُس کے عیوب کے درپے ہو جائے گا اور اللہ جس کے درپئے ہو جائے اُسے اُس کے گھر میں رسوا کر کے چھوڑ دے گا"

ــــ (" ابو داؤد ")

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

" تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپئے ہو گے تو اُن کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے" ــــ (" ابو داؤد ")

" خطا بینی" آج بھی مسلم معاشرہ کو گھُن کی طرح کھا رہی ہے اس لئے " وَلَا تَجَسَّسُوْا " پہ ذیل میں چند روایات نقل کی جا رہی ہیں۔ اِس موضوع پر طوالت کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ اقبالؔ نے تو صرف " خطابیں " کی عِلّت بتا کر سمندر کو کوزہ میں بند کر ڈالا ہے۔ اور اِصلاح کا جو اُن کا مقصد ہے وہ صرف اتنے سے پورا نہ ہو گا۔

" حیات الصحابہؓ " حصہ ششم میں " وَلَا تَجَسَّسُوْا " پر جو روایات نقل کی گئی ہیں۔ اُن

میں سے چند درج ذیل ہیں :-

حضرت مسور بن مخرمہ رضؓ سے روایت ہے کہ :-

" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے حضرت عمر رضؓ کی معیت میں (اُن رضؓ کے دورِ خلافت میں) ایک رات مدینہ میں چوکیداری کی - یہ دونوں حضرات چلے جارہے تھے کہ اُن کو ایک گھر میں چراغ کی روشنی دکھائی دی - یہ اُس کے معلوم کرنے کے لئے چلے - جب اُس گھر کے قریب ہوئے دروازہ بھڑکا ہوا تھا - کچھ لوگ تھے - اُن کی آوازیں بلند تھیں اور کچھ شور سا تھا - حضرت عمر رضؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا : " کیا تمہیں پتہ ہے یہ کس کا گھر ہے ؟ " اور خود ہی یہ بتایا کہ " یہ گھر ربیعہ بن اُمیہ بن خلف کا ہے - یہ لوگ اب شراب پئے ہوئے ہیں - تمہاری کیا رائے ہے ؟ " حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے جواب دیا : میرا خیال یہ ہے کہ ہم اِسی چیز کا ارتکاب کر چکے جس سے اللہ پاک نے منع کیا ہے - اللہ پاک نے فرمایا ہے : " وَلَا تَجَسَّسُوْا " کہ : " جستجوئے عیب نہ کرو " اور ہم تو تجسس میں لگ گئے - یہ سُن کر حضرت عمر رضؓ اُن لوگوں کو چھوڑ کر اُن کے پاس سے چلے گئے "۔

سدی رضؓ سے روایت ہے کہ :-

" حضرت عمر بن خطاب رضؓ (اپنے دورِ خلافت میں) نکلے اور آپ نے آگ کی روشنی دیکھی - آپ رضؓ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ تھے - آپ رضؓ اس روشنی کے پیچھے چل دیئے یہاں تک کہ ایک گھر میں داخل ہوئے اور اُسی گھر میں چراغ جل رہا تھا - یہ آدھی کا رات قصہ ہے - ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا - اُس کے سامنے شراب تھی اور ایک گانے والی کنیز تھی جو گا نا گا رہی تھی - اُس بڈھے کو پتہ نہ چلا کہ اچانک حضرت عمر رضؓ اس کے پاس داخل ہو گئے اور حضرت عمر رضؓ نے فرمایا : " میں نے اِس رات جیسا بُرا منظر نہیں دیکھا - ایک ایسے بوڑھے سے جو اپنی موت کا منتظر ہے ؟ " بڈھے نے اپنا سر حضرت عمر رضؓ کی طرف اٹھایا اور کہا : " بے شک اے امیرالمومنین ! جو کچھ آپ رضؓ نے کیا یہ کہیں زیادہ قبیح ہے

آپ نے تجسسِ عیب کیا اور تجسس سے منع کیا گیا تھا اور آپؓ بلا اجازت داخل ہوئے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تو نے سچ کہا"۔ اِس کے بعد حضرت عمرؓ اپنا کپڑا دانت سے پکڑ کر روتے ہوئے نکلے اور فرمایا: "اے عمر! تجھے تیری ماں گُم کرے اگر تیرا رب تیری مغفرت نہ کرے"۔ اُس آدمی نے کچھ دنوں تک حضرت عمرؓ کی مجلس میں آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن وہ آیا اور آخری صف میں بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے اُسے دیکھ لیا اور بلایا اور کان میں کہا: "قسم اُس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بنا کر بھیجا تھا۔ میں نے لوگوں میں سے کسی سے اِس چیز کو نہیں کہا جو میں نے تجھ سے دیکھی اور نہ ابنِ مسعودؓ سے کہا اگرچہ وہ میرے ساتھ تھے"۔ اُس بڈھے نے حضرت عمرؓ کے کان میں کہا: "اے امیرالمومنین! میں نے بھی اُس تاریخ سے دوبارہ وہ کام نہیں کیا ہے"۔ حضرت عمرؓ نے بلند آواز سے کہا: "اللہ اکبر" لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس سبب سے "اللہ اکبر" کہا ہے"۔

اِس اکیسویں بند کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں "خطا پوشی" کی صفت "خطا بینی" کے بدلے پیدا کرنے کی اقبالؔ نے تلقین کی ہے جو ماخوذ ہے درجِ ذیل آیت سے :۔

"ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اس کی صفت ہے"۔

— (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۶۳)

"احکام القرآن الجصاص" میں روایت منقول ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :۔

"جس نے کسی کا کوئی مخفی عیب دیکھ لیا اور اُس پر پردہ ڈال دیا تو یہ ایسا ہے جیسے کسی نے ایک زندہ گاڑی ہوئی بچی کو موت سے بچا لیا"۔

"خطا پوشی" پر "حیات الصحابہؓ" حصہ ششم سے چند روایات درج ذیل ہیں :۔

"شعبی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کیا کہ اُس کی لڑکی نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس سے اُس پر حدود اللہ عائد ہوتی تھی۔ اور جب قوم میں اس کا رشتہ آیا تو میں نے اُن کو اُس کی وہ حالت

جس پردہ بھی ہٹا دی۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا :۔ "کیا جس چیز کی اللہ پاک نے پردہ پوشی کی ہے تو اُس کو ظاہر کرنے کا قصد کرتا ہے ؟ خدا کی قسم ! اگر تو نے کسی شخص سے بھی اس کی حالت کا اعتراف کیا تو میں تجھے وہ سزا دوں گا جو تمام شہر والوں کے لئے باعث عبرت ہو جائے۔ جا اُس کا نکاح کر جس طرح ایک پاکدامن مسلمان عورت کا نکاح کیا جاتا ہے"۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کے کاتب دخیر ابوالہشیمؒ بیان کرتے ہیں کہ :۔

"میں نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے عرض کیا کہ ہمارے چند پڑوسی ہیں جو شراب نوشی کرتے ہیں اور میں اُن کے لئے سپاہیوں کو بُلانے والا ہوں تاکہ وہ اُنہیں گرفتار کریں۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا تیری خرابی ہو ایسا نہ کر۔ پس بیشک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپؐ فرماتے تھے : "جس نے پردہ پوشی کی گویا اُس نے زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو زندہ کیا ہے"۔

حضرت بلال بن سعد الشعریؒ سے روایت ہے کہ :۔

"حضرت معاویہؓ نے حضرت ابودرداؓ کے پاس لکھا کہ تم میرے پاس دمشق کے فاسقوں کی فہرست بھیجو۔ حضرت ابودرداؓ نے اُن کے نام حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ نہیں فرمائے۔

اس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال نے یہ طنز کیا ہے کہ : "چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم"۔ یعنی سربلندی اور ترقی کی خواہش تو ہر شخص رکھتا ہے۔ اور دوسرے ہی مصرعہ میں وہ اِس سربلندی یعنی سیارہ ثریا (جسے پروین بھی کہتے ہیں) تک پہنچنے کی شرط قرآنی معنوں میں "قلب سلیم پیدا کئے جلنے کی رکھتے ہیں۔ "قلبِ سلیم" قرآنی اصطلاح ہے اور اسے قرآنی معنوں ہی میں سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ الفاظ یا ترکیب کے لغوی معنی پر۔ یہ اصطلاح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں سورۃ الصّٰفّٰت، ۳۷ کے رکوع ۳ میں اس طرح وارد ہوئی ہے :۔

"اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) جب اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا : "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو ؟ اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے

ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے ؟"

ایک اور موقع پر سورۃ الشعراء ۲۶ کے رکوع ۵ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے سلسلہ میں "قلب سلیم" کی اصطلاح وارد ہوئی ہے جو اس اصطلاح کی وضاحت اور تشریح بھی ہے :۔

" ابراہیمؑ نے دعا کی) : " اے میرے رب ، مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ اور مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اُس دن (روزِ حشر) رُسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائیں جائیں گے۔ جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد ، بجز اس کے کوئی شخص قلبِ سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو (اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ) "۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" میں سورۃ "الصّٰفّٰت ۳۷ کے حاشیہ ۴۴ میں "قلب سلیم" کی تشریح اس طرح کی ہے :۔

"قلبِ سلیم" کے معنی "صحیح سلامت دل" کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو۔ جس میں کفر و شرک اور شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو۔ جسمیں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو۔ جسمیں کوئی اینچ پینچ اور اُلجھاؤ نہ ہو۔ جو ہر قسم کے برُے میلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو۔ جس کے اندر کسی کے لئے بغض و حسد و بدخواہی نہ پائی جاتی ہو۔ جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

اِس بند کے آخری شعر میں اقبال نے اِسی "اَوجِ ثریّا" پر مقیم اسلاف کی یاد دلائی ہے جنہوں نے نہ صرف "قلبِ سلیم" کی وجہ کر "تختِ فغفور" اور "سریرِ کَے" کی بلندیوں کو چھُوا۔ فغفور چین کے بادشاہ کو کہتے ہیں اور "کَے" کی اصطلاح پر چھٹے بند کے آخری شعر پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

اِس اکیسویں بند کے آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں یہ ساری باتیں کہہ چکنے پر مسلمانوں پر اقبال طنز کرتے ہیں کہ :۔

"یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی ؟" حمیّت کے لغوی معنی غیرت ، ننگ اور شرم کے ہیں اور اقبال اس مصرعہ میں مسلمانوں کی اِسی حمیّت کو للکارتے ہیں۔

بائیسواں بند

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار	تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار	تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

اس بند میں اقبالؔ نے اسلاف کے اوصافِ حمیدہ اور اُن کی غیرت و خودداری، قوم و ملت پر اُنکی جاں نثاری اور اُن کے راہِ عمل کی یاد دلائی ہے جن کی بنا پر ہی اُنھوں نے دنیا میں سروری حاصل کی اور جس سروری کے نقوش آج بھی صفحۂ ہستی پر موجود ہیں۔ اس کے برعکس آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان ساری صفات کے نہ ہونے کی وجہکر ہی کلی تک کو ترس رہے ہیں جب کہ اُن کے اسلاف اسی چمن میں "گلستاں بہ کنار تھے۔

اقبالؔ پہلے شعر میں طنز کرتے ہیں کہ تم اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو تباہ کر رہے ہو جبکہ تمہارے اسلاف غیرت مند اور خوددار تھے۔ تم اخوت یعنی آپس کی محبت سے گریزاں ہو یعنی ایک دوسرے کے دشمن ہو جب کہ وہ قوم و ملت کے لئے ہر طرح کی جانی و مالی قربانیاں دینے کو تیار رہتے تھے اور دیتے بھی تھے۔

اس بند کے دوسرے شعر میں اقبالؔ تف کرتے ہیں کہ تم "سراپا گفتار" یعنی باتیں بنانی جانتے ہو لیکن تمہارے اسلاف "سراپا کردار" یعنی عامل بہ عمل تھے۔ تم کلی کو ترستے ہو یعنی تم دولت، عزت اور شہرت کو ترستے ہو جب کہ یہ ساری نعمتیں صرف اُن کے "سراپا کردار" ہونے کی وجہکر اُن کے قدموں کو چومتی تھیں۔ جسے اقبالؔ نے "گلستاں" بہ کنار" کہا ہے۔

اس بند کے تیسرے شعر میں اقبالؔ یہ تلقین کرتے ہیں کہ اسلاف کے متعلق یہ ساری باتیں آج بھی عالمی تاریخ کا حصہ ہیں اور تاریخ آج بھی اُن کے کارناموں پر فخر کرتی ہے۔

اقبال صرف عام مسلمانوں ہی کے "سراپا گفتار" ہونے پر حسرت زدہ نہیں تھے بلکہ وہ واعظوں اور مصلحین قوم کی بے عملی اور اُن کی "سراپا گفتاری" پر بھی آنسو بہاتے تھے۔ چنانچہ "بانگ درا" کے سب سے اخیر میں "ظریفانہ" کے تحت ایک قطعہ میں اِن سارے عیوب کو اپنی طرف منسوب کرکے ایسے واعظوں اور مصلحین قوم کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو یہ بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

تیئسواں بند

شل انجم اُفقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے　　　بُتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے　　　بے عمل تھے ہی جواں، دین سے بدظن بھی ہوئے

اُن کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کی یاد تو دلاتے ہیں جبکہ دین کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنے کی وجہ سے اُنہیں سروری حاصل تھی مگر اسی شعر کے دوسرے مصرعہ میں اُن کے دعوئ ایمان پر کاری ضرب بھی لگاتے ہیں۔ وہ یہ کہ تم نے کفر کا رویّہ اختیار کر لیا۔ رسول اللہ ؐ کے اتباع کے بدلے تم نے "تازہ خداؤں" کی پرستش شروع کر دی جو تمہارے زوال کا باعث بنی۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی وہ طنز کرتے ہیں کہ دنیاوی ترقی کی دُھن میں تم "مہجورِ نشیمن" ہو بیٹھے یعنی اپنی دینی اور ملّی روایات سے بیگانہ ہو گئے۔ دوسرے مصرعہ میں "عمل" کا لفظ بہت اہم ہے اور اقبالؔ نے اس لفظ کو قرآنی معنوں میں استعمال کیا ہے اور اُس کا پس منظر "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ہے نہ کہ وہ عمل جو قرآنی معنوں میں "صالح" نہ ہو۔ انہی معنوں میں اقبال طنز کرتے ہیں کہ تم "بے عمل" تو تھے ہی تم نے دین سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

تیسرے شعر میں وہ مسلمانوں کی آزادئ فکر اور عمل پر ضرب لگاتے ہیں جس نے انہیں شریعت کے ہر قید و بند سے آزاد کر دیا اور جس دل و دماغ میں کبھی کعبہ بستا تھا اب وہ صنم خانہ بن گیا یعنی ایمان کے بدلے کفر کو لا بسایا گیا۔

اقبالؔ نے آخری شعر میں دین کے قید و بند سے آزادی حاصل کرنے ہی کو اپنے کلام میں بہت سے مقامات پر "آزادئ افکار" کا نام دیا ہے جو اُن کی نظر میں مسلمانوں کے زوال کا باعث بن جاتا ہے۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کی نظم "آزادئ فکر" میں کہتے ہیں ؎

آزادیٔ افکار سے ہے اِن کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

اس بند کے آخری شعر میں تو اقبالؔ نے شاعرانہ ضابطوں کو ملحوظ رکھ کر مدافعتی انداز میں اس "آزادیٔ افکار" پر صرف اتنا ہی کہا کہ: "لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا" مگر وقت کے گزرنے اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے مُضر اثرات کو دیکھ کر آخر عمر میں مسلمانوں کے "آزادیٔ افکار" نے اُن میں جھنجھلاہٹ اختیار کرلی اور وہ "ضربِ کلیم" ہی کی نظم "آزادی" میں چیخ اُٹھے کہ:-

ہے کس کی یہ جُرأت کہ مسلماں کو ٹوکے — حُرّیتِ افکار کی نعمت ہے خُداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ پارس — چاہے تو کرے اُس میں فرنگی صنم آباد!
قرآن کو بازیچۂ تاویل بناکر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مُملکت ہند میں اِک طُرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

اس بند میں اقبالؔ نے مجموعی طور پر درجِ ذیل آیات کی بلا واسطہ ترجمانی کی ہے:-

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ بہت سے لوگ ایسا پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہوگا" —— (سورۃ المائدہ ۵ رکوع ۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اُس کے جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جد و جہد کرو، شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوجائے - خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کُفر کا رویّہ اختیار کیا ہے، اگر اُن کے قبضہ میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اُس کے ساتھ، اور وہ چاہیں کہ اُسے فدیہ میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ اُن سے قبول نہ کی جائے گی اور اُنہیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔

وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انہیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا" ـــ (سورۃ المائدۃ ۵۔رکوع ۵)

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے" ـــ (سورۃ المائدہ ۵۔رکوع)

چوبیسواں بند

قیس زحمت کشِ تنہائیٔ صحرا نہ رہے　　شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے　　یہ ضروری ہے، حجابِ رُخِ لیلیٰ نہ رہے
گلۂ جَور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حُسن بھی آزاد نہ ہو

اس بند میں اقبالؔ نے نئی نسل کی بے راہ روی اور غیر اسلامی طرزِ زندگی پر طنز کیا ہے اور ساتھ ہی اُن کی آرام طلبی کو بھی۔

پچیسواں بند

عہد نو برق ہے، آتش زنِ ہر خرمن ہے　　ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے　　مِلّتِ ختمِ رُسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اس بند کے پہلے دو اشعار میں "عہد نو" جسے اقبالؔ نے دوسری جگہ "تہذیب نوی" بھی کہا ہے کو برق یعنی بجلی سے تعبیر کیا ہے جس کے زد میں ہر خرمن آجاتا ہے اور کوئی صحرا یا گلشن اُس کی زد سے نہیں بچ سکتا اور نتیجتاً "مِلّتِ ختمِ رُسلؐ" بھی "شعلہ بہ پیراہن" ہے۔

اقبالؔ اس بند کے پہلے دو اشعار میں "عہدِ نو" کو برق سے تعبیر کرکے اس کی لائی ہوئی تباہی کو ذہن نشیں کراتے ہیں جس کی زد میں امت مسلمہ بھی ہے۔ اس "برق" پر مزید روشنی اقبال نے "ضربِ کلیم" کی نظم "عصرِ حاضر" میں ڈالی ہے جس "برق" سے اُن کی مُراد "لادینیٔ افکار" ہے چنانچہ کہتے ہیں :-

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی ۔۔۔ اِس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام !

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر ۔۔۔ چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط نظام !

مُردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق

عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

چونکہ اس بند کے پہلے ہی شعر میں اقبالؔ نے "برق" کی بات کی ہے اِس لئے اُسی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کی باتیں اس بند کے تیسرے شعر میں لائی گئی ہیں۔ "برق" سے یہاں مُراد چونکہ کفر ہے اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا واقعہ کفر و ایمان سے تعلق رکھتا ہے اس لئے باوجودیکہ "عہدِ نو" برق ہے مگر اُس کا بھی معاملہ اُسی ایمان سے کیا جا سکتا ہے جس ایمان سے حضرت ابراہیمؑ نے مقابلہ کیا تھا اور وہ آگ جس طرح اُن کیلئے گلستاں بن گئی اُسی طرح "عہدِ نو" کا برق بھی اہل ایمان کے لئے گلستاں بن سکتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا قصہ اُس واقعہ سے شروع ہوتا ہے جب کہ ان کی قوم نے بتوں کی پرستش چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار نہیں کیا تو جیسا قرآن میں مذکور ہے :-

"وہ (حضرت ابراہیمؑ) چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا: آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں ؛ کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں ؟ اِس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں"۔

—— (سورۃ الصّٰفّٰت، ۳۷- رکوع ۳)

اس واقعہ کو تفصیلی طور پر سورۃ الانبیاءؑ ۲۱ کے رکوع ۵ میں بیان فرمایا گیا ہے :-

"اُس سے بھی پہلے (یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے پہلے) ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ : "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ

پوج رہے ہو؟" ۔ انہوں نے جواب دیا: "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے" ۔ اُس نے کہا: "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" ۔ انہوں نے کہا: "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟" اُس نے جواب دیا: "نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا" ۔ چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اُس کی طرف رجوع کریں۔ (انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے: "ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ" ۔ (بعض لوگ) بولے: "ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے" ۔ انہوں نے کہا: "تو پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُس کی کیسی خبر لی جاتی ہے)" ۔ (ابراہیم کے آنے پر) انہوں نے پوچھا: "کیوں ابراہیم، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے" ۔ اُس نے جواب دیا: "بلکہ یہ سب کچھ ان کے اِس سردار نے کیا ہے، اِن ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں" ۔ یہ سُن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: "واقعی تم خود ہی ظالم ہو" ۔ مگر پھر اُن کی مت پلٹ گئی اور بولے: "تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں" ۔ ابراہیمؑ نے کہا: "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟" ۔ اُنہوں نے کہا: "جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے" ۔ ہم (خدا) نے کہا: "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر" ۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں۔ مگر ہم نے اُنہیں بُری طرح ناکام کر دیا" ۔

حضرت ابراہیمؑ کے اس جرم میں آگ میں ڈالے جانے کا ذکر دوسرے مواقع پر قرآن میں اس طرح بھی وارد ہوا ہے :-

"انہوں (کافروں) نے آپس میں کہا کہ : "اس کے لئے ایک آلاؤ تیار کرو اور اُسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو"۔ اُنہوں نے اُس کے خلاف ایک کاروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا"۔

— (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ رکوع ۳)

"پھر ابراہیمؑ کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُنہوں نے کہا : "قتل کردو اُسے یا جلا ڈالو اِس کو"۔ آخر کار اللہ نے اُسے آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لانے والے ہیں"۔

— (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۳)

قرآن مجید میں نمرود کا نام کہیں نہیں وارد ہوا ہے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا حکم بادشاہ وقت نمرود سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر تلمود میں اس واقعہ کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ آذر تھے جن کا پیشہ بُت بنا کر بیچنا تھا اور وہ نمرود کی حکومت میں بہت بڑے عہدے پر فائز تھے اور اُنہی کی وجہ کر یہ سزا صادر کی گئی۔ اب سوال یہ آتا ہے کہ اگر "عہد نو" برق ہے تو حضرت ابراہیمؑ کا وہ کون سا ایمان تھا جس نے اُس آگ اور آلاؤ کو ٹھنڈا کر کے گلستان بنا دیا اور اس برق کا مقابلہ اقبالؔ اُسی ایمان سے کرنے کی صلاح دے رہے ہیں۔ یہ ایمان ہے "یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لینا جو زمین اور آسمانوں کا موجد ہے"۔ یعنی جس ایمان میں کسی شرک یا شک کا شائبہ نہ ہو۔ اِس ایمان کا ذکر قرآن میں بالتفصیل وارد ہوا ہے جو درج ذیل ہے اور اِس ایمان کے ساتھ ہم نماز میں کھڑے ہوتے ہی وہ کلمات پڑھتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے زبان مبارک سے نکلے تھے :-

"ابراہیمؑ پکار اٹھا : "اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اُسی ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" ـــ (سورۃ الانعام ۶ ـ رکوع ۹)

اقبالؔ اِس بند کے آخری شعر میں اِسی "یکسوئی" کی تلقین کرتے ہیں۔ جو حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کا طرّۂ امتیاز تھا اور جس کی پیروی کی تاکید خود خدا نے فرمائی ہے کیونکہ یہی ایمان، قرآن کی رو سے "طریقِ زندگی" ہے :-

"اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویّہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا)" ـــ (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۲۵)

یہ ہے وہ ایمان جس سے "عہدِ نو" کا برق کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی کفر کا مقابلہ اِسی ایمان سے کیا تھا اور اِس آزمائش میں پورے اُترے تھے۔ جیسے اقبالؔ نے "بالِ جبریلؑ" کی منزل ۱۶ میں اِس طرح ذہن نشیں کرایا ہے ؎

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند!

اور پھر "بانگِ درا" کی نظم "کفر و اسلام" میں کہتے ہیں ؎

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

چھبیسواں بند

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گُل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

اب تک کے بندوں میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے ایمان، اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل اور طریقِ

زندگی کو طنز کا نشانہ بنایا مگر وہ اس نظم "جوابِ شکوہ" میں صرف لعن طعن کر کے نہیں رہ جاتے بلکہ خوش آئند مستقبل کی اِس چھبیسویں بند سے نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اِس بند میں وہ مسلمانوں کو ڈھارس بندھاتے ہوئے خدا کے اِن وعدوں کی یاد دلاتے ہیں جو خدا نے سچے مومنوں سے کی ہے:۔

"دِل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو"

—— (سورۃ آلِ عمران ۳- آیت ۱۳۹)

"ہم کسی شخص کو اُس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے، جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک بتا دینے والی ہے۔ اور لوگوں پر ظلم بہر حال نہیں کیا جائے گا" —— (سورۃ المؤمنون ۲۳- آیت ۶۲)

"اللہ کسی متنفس پر اُس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اُس کا پھل اُسی کے لئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اُس کا وبال اُسی پر ہے" —— (سورۃ البقرہ ۲ — رکوع ۴۰)

"(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے" —— (سورۃ الزمر ۳۹- آیت ۵۳)

"یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دُنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اُس روز بھی کریں گے جب (روزِ حشر) گواہ کھڑے ہوں گے" —— (سورۃ المؤمن ۴۰- آیت ۵۱)

"جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اِس پر پھول جاتا ہے۔ اور جب اُن کے اپنے کئے کرتوتوں سے اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے) یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں"

—— (سورۃ الروم ۳۰- رکوع ۴)

ستائیسواں بند

اُمّتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں	اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں	سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

اس بند میں بھی اقبالؔ نے مسلمانوں کو نا اُمید نہ ہونے کی ہی تلقین کی ہے۔ اُنہوں نے اِس "گلشنِ ہستی" میں ملتوں کی کامیابی و ناکامیابی ثمر چیدہ اور خزاں دیدہ دونوں کا ذکر لاکر اس نکتہ کو ذہن نشیں کرایا ہے کہ ملّت اور قوموں کی تاریخ میں یہ ایک قانونِ فطرت ہے۔ اور انہی کامیابیوں اور ناکامیوں میں ملّتِ اسلامیہ" برومندی یعنی کامیابی سے سرفراز ہوتی رہی ہے اِس لئے کہ "پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا" یعنی اسلام کی خدمت دُنیا کی مختلف قوموں نے ہمیشہ کی ہے اور ایسا آئندہ بھی ہوگا۔ اس بند کے پہلے دو اشعار کو درجِ ذیل آیت کی روشنی میں پڑھا جاسکتا ہے:۔

"پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن قوموں کا انجام اُنہیں نظر نہ آیا جو اِن سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لئے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی"۔

—— (سورۃ یوسف ۱۲۔ آیت ۱۰۹)

اٹھائیسواں بند

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا	تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا	غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

اس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال مسلمانوں کو یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ مسلمان

قوم کسی خاص وطن یا خطۂ زمین سے وابستہ نہیں۔ کسی ملک یا قوم کے تباہ ہونے سے اسلام نہیں مٹ سکتا۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے "سورۃ یوسف ۱۲" کے واقعات کی تلمیح بہت ہی بلیغ انداز میں کی ہے۔ حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ کے فرزند اور حضرت اسحاقؑ کے پوتے اور حضرت ابراہیمؑ کے پر پوتے تھے۔ فلسطین میں آپ سبھی انبیاء علیہم السلام کا جائے قیام حبرون میں تھا اور اسی خطے کو کنعان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کو چار بیویوں سے بارہ بیٹے تھے جن میں ایک بیوی سے صرف دو فرزند تھے۔ ایک حضرت یوسفؑ اور دوسرے بن یمین سوتیلے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے قتل کی سازش کی اس لئے کہ جیسا قرآن میں مذکور ہے۔

اُس (حضرت یوسف) کے بھائیوں نے آپس میں کہا: "یہ یوسف اور اس کا بھائی (بن یمین) دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسفؑ کو قتل کردو یا اُسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔ اِس پر اُن میں سے ایک بولا: "یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اُسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اُسے نکال لے جائے گا"

— (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۲)

چنانچہ بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں ڈال دیا اور ایک قافلے نے کنوئیں سے اُنہیں نکال لیا اور اُنؑ کو "مالِ تجارت سمجھ کر چھپا لیا (وَ اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً)" اور مصر میں لے جا کر "تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا"۔ مصر میں جس شخص نے آپؑ کو خریدا نہ اُس کا نام قرآن مجید میں ہے اور نہ اُس کی بیوی کا۔ صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ :-

"مصر میں جس شخص نے اُسے خریدا اُس نے اپنی بیوی سے کہا: اِس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو یا ہم اُسے بیٹا بنالیں"

— (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۳)

اِن میں اس شخص کو "مَلِكَ" کہا گیا ہے اور سورۃ یوسف ۱۲ کے آیت ۳۰ میں اسے "عزیز"

سے یاد کیا گیا ہے اور دوسرے موقع پر آیت ۸۰ میں یہی لقب حضرت یوسفؑ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ تلمود میں اس عورت کا نام زلیخا (زلیخا) لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا۔ مصر کے قیام میں "عزیزِ مصر" نے ملک کے خزانے آپ کے سپرد کر دیئے اور یہ نتیجہ تھا خدا ترسی (تقویٰ) کا۔ ارشاد ہے :-

"اِس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اِس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا اور آخرت کا اجر اُن لوگوں کے لئے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے

(وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ)"

—— (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۷)

اِس بند کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ ہی اِس بند کا کلیدی مصرعہ ہے جس میں اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیات اور حضرت یوسفؑ سے متعلق قرآنی قصّوں کو ذہن نشیں کرایا ہے اور اِسی لئے اِس قصہ کی مختصر سی تفصیل اِس مصرعہ کو گرفت میں لانے کے لئے دی گئی ہے۔ اس پورے بند میں اس مصرعہ کے پسِ منظر میں اقبالؔ مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ " ایمان" اور " خدا ترسی" ہی ہونے پر خدا کسی کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔ اِنہی نکتوں کو اقبالؔ نے " بانگِ درا" کی نظم " طلوعِ اسلام" کے اِس شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

اِس بند کے دوسرے شعر میں گزرے ہوئے واقعات کی مناسبت ہی سے اقبالؔ نے الفاظ "قافلہ" " بانگِ درا" اور " ساماں" استعمال کیا ہے۔ یہ " بانگِ درا" ہے " نغمۂ توحید" جس آواز میں سُرِ ایمان اور " خدا ترسی" سے ترتیب پاتی ہے۔ اور " ساماں" ہے کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

اِس بند کے دوسرے شعر ہی جیسی اُمید اقبالؔ نے " بانگِ درا" کی نظم " شمع و شاعر" میں اِس طرح بھی دلائی ہے ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اُنتیسواں بند

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دُھندلا سا ستارا تو ہے

اِس بند میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو ناکامیوں کے بعد کامیابیوں سے سرفراز ہونے کے چند تاریخی واقعات کی یاد دلائی ہے۔ پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں ایران کے مٹنے کا ذکر۔ ۱۹۰۷ میں روس نے ایران کو تقسیم کر کے ایک حصہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور آج بھی اُس کا ایک صوبہ آذربائیجان روسیوں کے زیرِ نگیں ہے گرچہ روسی آئین میں روس کے جتنے بھی صوبے ہیں اُسے خود مختار آزاد مملکت کہا جاتا ہے۔ اقبالؔ جب ایران کے مٹنے کی بات کرتے ہیں تو وہ بچے ہوئے ایران پر دوسرے مغربی سامراجیوں کا تسلط قائم ہونے کی باتوں کا ذکر لاتے ہیں۔ مگر وہ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک بلیغ نکتہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر پیمانہ ٹوٹ گیا یعنی ایران کا مٹنا اگر پیمانہ مان لیا جائے تو اُس سے اسلام کی سربلندی کے نشہ کو کوئی تعلق نہیں۔ نشہ شراب میں ہوتا ہے پیمانہ میں نہیں۔ اسلام کا وجود ایک ایران پر منحصر نہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک مسلمان کا تصورِ حیات سکوتی نہیں حرکتی ہے۔ چنانچہ اس نکتہ کو اُنہوں نے "بالِ جبریل" کی غزل ۳۰ کے اِس شعر میں اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے ؎

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!

اِس بند کے دوسرے شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اسلام کا وجود کسی پیمانہ (ایران) پر منحصر نہیں اور اگر مسلمانوں کو تاریخی شہادت درکار ہے تو وہ سلطنت عباسیہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اس سلطنت کو تاتاریوں نے تو تباہ کر دیا مگر وہی تاتار جب بعد میں مسلمان ہوتے گئے تو

وہی اسلام کے محافظ بن گئے جسے اقبالؔ نے اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اس طرح کہا ہے"؛ پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"۔ اِس شعر میں اقبالؔ نے "یورشِ تاتار" کے افسانے کی یاد دلائی ہے۔ یہ تاتاری کہیں مستقل سکونت اختیار نہیں کرتے۔ اِن کا اصل وطن منگولیا تھا جو ابھی بھی چین کے مغربی سرحد پر ایک آزاد ملک ہے۔ یہ نیم وحشی زندگی گزارتے تھے۔ اِن کا مشہور سردار چنگیز خاں تھا جس کے جانشینوں نے آگے چل کر خلافت عباسیہ کو ختم کیا۔ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد "خلافتِ راشدہ" سنہ ۱۱ھ تا سنہ ۴۰ھ (مطابق ۱۶۱ء تا ۶۳۲ء) تک قائم رہی۔ اُس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ بن سفیان نے سنہ ۴۱ھ (مطابق ۶۶۲ء) میں "خلافت بنی اُمیہ" قائم کیا اور دمشق کو دارالسلطنت بنایا۔ یہ خلافت سنہ ۱۳۲ھ (مطابق ۷۵۰ء) میں عباسیوں کے ہاتھوں ختم ہوگئی اور اس کے بعد "خلافت عباسیہ" قائم ہوئی جس کا دارالسلطنت بغداد رکھا گیا اور جن کا دورِ حکومت سنہ ۱۳۲ھ (مطابق ۷۵۰ء) سے سنہ ۶۵۶ھ (مطابق ۱۲۵۸ء) تک رہا۔ اِس خلافت کی بِنا ابو العباس عبداللہ سفاح نے رکھی جو رسول اللہؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے تھے۔ اِس خلافت کو تاتاریوں نے ختم کیا جس کا ذکر اِس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے کیا ہے۔ ہلاکو خاں نے جو چنگیز خاں کے جانشینوں میں تھا ۶۵۵ھ (مطابق ۱۲۵۷ء) میں بغداد پر حملہ کر دیا اور "خلافتِ عباسیہ" کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ بن مستنصر کا اُسی سال بے دردانہ قتل کر کے "خلافتِ عباسیہ" کا چراغ گُل کر دیا۔ اقبالؔ نے اِسی افسانے کی یاد دلائی ہے۔ اور یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ یہ تو "صنم خانے" کے رہنے والے یعنی غیر مسلم تھے مگر آج عراق (جس کا دارالسلطنت آج بھی بغداد ہی ہے) کے قریب چار کروڑ کی آبادی میں ۹۸ فیصدی مسلمان ہیں اور "کعبے کی پاسبانی" کر رہے ہیں۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ :-

"اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو (کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ) جسے انسان کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" —— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۲)

اس بند میں اقبالؔ نے جن نکتوں کو مسلمانوں کو ذہن نشیں کرایا اُن کی اگر تلخیص کی جائے تو "بانگِ درا" کی نظم "شمع و شاعر" کا یہ شعر ہو سکتا ہے ؎

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

تیسواں بند

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا　　غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا　　امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

اِس بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں بلقان جنگ کا ذکر کیا گیا ہے. جب کہ بلغاریہ نے سلطنت عثمانیہ (خلافتِ ترکی) پر حملہ کر دیا تھا. بلغاریہ وسطی یورپ کا ایک ملک ہے جس پر ترکوں نے ۱۳۹۶ء سے پانچ سو سال تک حکومت کی مگر ۱۸۷۶ء میں روس سے مدد لیکر بلغاریہ نے ترکوں کو شکست دی اور ۱۸۷۸ء کے برلن کانگریس میں طے پائے معاہدہ کے تحت صرف شمالی بلغاریہ ہی ترکی کے زیرِ نگیں بچ گیا جو پہلی جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء کے بعد ترکی کے ہاتھ سے جاتا رہا. اِس ملک کی آبادی آج قریب ایک کروڑ ہے. جس میں ۹ فیصدی ترک مسلمان ہیں. اقبال نے "یورشِ بلغاری" سے انہی صورتِ حال کا ذکر کیا ہے جس پر مسلمان بہت برافروختہ تھے. مگر اس پہلے شعر کے دوسرے ہی مصرعہ میں اقبال مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ اگر آج بلغاریہ تمہارے ہاتھوں سے جا رہا ہے تو یہ تمہاری غفلت کا نتیجہ ہے اور یہ تم جیسے غافلوں کے لئے بیداری کا پیغام لایا ہے.

دوسرے شعر میں بھی اقبال نے باتیں وہی کہی ہیں یعنی "یورشِ بلغاری" تمہاری دل آزاری کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ تمہارے جذبۂ ایثار و قربانی اور تمہاری خودداری اور غیرت کے لئے للکار ہے کہ تم دینِ اسلام کو سربلند رکھنے کے لئے کچھ کرنے کو تیار ہو یا؛ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا رہنا ہی تمہیں پسند ہے.

اِس بند کے پہلے دو اشعار درجِ ذیل آیات کے ترجمان ہیں :-

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ:

"ہم ایمان لائے" اور اِن کو آزمایا نہ جائے گا ؛ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون" ــــ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۱)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنّت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اُس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اُس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔" ــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۴)

اِس بند کے اِن دو پہلے اشعار میں اقبال نے مسلمانوں کو جو جہاد کی تلقین کی ہے اِسی نکتہ کو اُنہوں نے "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گُل افغان کے افکار" کے اگیارہویں بند میں فلسفیانہ انداز میں اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے ؎

مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گِلہ
بندۂ حُر کے لئے نَشترِ تقدیر ہے نوش

نظم "شکوہ" میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ ؎

خندہ زن کُفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں ؛
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں ؛ (دیکھیں ضمیمہ نمبر ۲، پندرھواں بند)

اِس آخری شعر اور اِس تیئسویں بند کے پہلے دو اشعار میں جو باتیں ذہن نشیں کرائی گئی ہیں وہ درجِ ذیل آیات پر بھی مبنی ہیں :۔

"تمہارا (رسول اللہ) بھلا ہوتا ہے تو انہیں (منکرین اور مُشرکین کو) رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ مُنہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ اِن سے کہو: "ہمیں ہرگز کوئی (بُرائی یا بھلائی)، نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے، اور اہلِ ایمان کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ)" ــــ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۷)

"مسلمانو، تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آ کر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب

اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر اِن سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی (تقویٰ) کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے"

—— (سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۸۶)

" ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مُجاہد اور ثابت قدم کون ہیں"

—— (سورۃ محمد، ۴۷۔ آیت ۳۱)

" ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ (منکرین) تم پر بناتے ہیں۔ اِن سے تمہارے دِل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ (اِس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، اُس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ، اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے"

—— (سورۃ الحجر ۱۵۔ رکوع ۶)

اِس بند کے آخری شعر میں اقبال نے مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی ہے کہ دُشمنوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گھبرانے کی بات نہیں اس لئے کہ خُدائے تعالیٰ کا خود یہ قول ہے کہ :۔

" اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اِس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہذا (امورِ غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خُدا ترسی کی روشن پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا"

—— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۷۹)

اِس آخری شعر کے آخری مصرعہ کو گرفت میں لانے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ قرآن میں نورِ حق" کسے کہتے ہیں۔ تب ہی ہم اقبال کے اس مصرعہ میں کیا نکتہ پیش کر رہے ہیں سمجھ پائیں گے:۔

" اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اُس کے نُور کی مثال ایسی ہے

جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑک پڑتا ہو چاہے آگ اُس کو نہ لگے۔ (اِس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے ...... جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لئے پھر کوئی نور نہیں"

— (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۵)

اب اِس آخری شعر کے دوسرے مصرعہ پر قرآنی تلمیح ملاحظہ فرمائیے:۔

"یہ لوگ (مشرکین) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی (نُورَ اللّٰہِ) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" — (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۵)

"یہ لوگ اپنے مُنہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور (نُورَ اللّٰہِ) کو بجھانا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" — (سورۃ الصّف ۶۱۔ رکوع ۱)

اِکتیسواں بند

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری — ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری — کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اِس بند میں اقبالؔ مسلمانوں کو اُس کی اصلیت کی آگاہی دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اِس اصلیت کی آگاہی اپنے اُردو کلام میں مختلف جگہوں میں دی ہے۔ اِس بند کے پہلے شعر میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہی باتیں اُنہوں نے "بانگِ درا" کی نظم "شمع و شاعر" کے دسویں بند میں بھی کہی ہیں یعنی تجھ میں خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہونے کی صلاحیت تو موجود ہے مگر یہ صرف چشمِ اقوام ہی سے نہیں تجھ سے بھی مخفی ہے۔ کہتے ہیں :-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اِس بند کا دوسرا شعر درج ذیل آیات کا ترجمان ہے :-

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لئے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اِس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائیگا۔"

—— (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۷)

اِس بند کے آخری شعر میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :-

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، اِسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ نے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چُن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی مِلّت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا

نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ۔ بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"

—— (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۱۰)

اس پورے بند میں اقبال نے جتنی باتیں کہی ہیں یہی باتیں اور بھی وضاحت کے ساتھ "بانگِ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے تیسرے بند میں ملتی ہیں اور ان کا مطالعہ نفسِ موضوع کے پیشِ نظر خارج از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہتے ہیں :-

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمیؑ ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تیسواں بند

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا — رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اِس بند کے پہلے دو اشعار میں اقبال نے ترغیبِ عمل کے رجحانات کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی صلاح

ہے کہ اسلام کا پیغام لے کر دنیا میں پھیل جاؤ۔ اسلام میں یہ خوبی ہے کہ تمہاری تنک مائگی یعنی کمزوری طاقت میں بدل جائے گی اور نغمۂ توحید سے ایک طوفان بپا ہو جائے گا۔ آخری شعر میں وہ عشقِ رسولؐ میں گرویدگی ہی کو موجب فلاح قرار دیتے ہیں اور اس بند سے لے کر آخری بند تک وہ یہی نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں۔ اقبالؔ کے کلام میں ہر جگہ عشق سے مراد عشقِ رسولؐ ہی ہے۔

تینتیسواں بند

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اس بند میں اقبالؔ نے جن الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اس پر روشنی ڈالنی مجھ جیسے انسان سے جسے ہمیشہ اپنی ادبی کم مائگی کا احساس رہا ہے اور ہے، ممکن نہیں۔ اس نذرانۂ عقیدت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ موتی کی طرح پرو دئے گئے ہوں، یہ ثبوت ہے صرف اقبالؔ کی قادر الکلامی ہی کا نہیں بلکہ اقبالؔ کے عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کا۔

اس بند میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اگر حضور اقدسؐ کی ذاتِ مبارک نہ ہو تو یہ دنیا تیرہ و تار ہو جائے اور اس کی ساری رونق ختم ہو جائے جس طرح ساقی کے نہ ہونے پر نہ مے باقی رہتی ہے اور نہ خم کا پتہ رہتا ہے اسی طرح اگر رسولؐ نہ ہو تو پھر توحید کا نام لینے والا بھی نہ رہے گا اور نہ توحید ہی رہے گی۔ آخری شعر میں یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ یہ کائنات صرف حضورؐ ہی کے نام کی برکت سے قائم ہے اور ہستی کی نبض میں آپؐ ہی کی بدولت حرکت اور زندگی ہے۔

اقبالؔ نے اپنے اردو کلام میں ہر جگہ مومنوں کو "بلبل" سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "پھول" سے مماثلت دی ہے۔ چنانچہ "بانگِ درا" کی نظم "صدیقؓ" میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان پر یہ شعر ڈالا ہے

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول بس!

اقبالؔ نے اِس شعر کے پہلے مصرعہ میں صرف "بُلبُل" اور "پھول" کی تمثیلات ہی استعمال نہیں کی ہیں بلکہ "پروانے" اور "چراغ" کی تمثیلوں میں درج ذیل حدیث کی تلمیح بھی کی ہے۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"میری مثال اُس شخص کی سی ہے جو آگ روشن کرے۔ اُس میں اِدھر اُدھر سے پروانے اور کیڑے اور مچھر آ کر گرنا شروع کریں"

— (تجرید صحیح بخاری شریف" اُردو۔ نمبر شمار ۱۳۰۶)

اس بند میں اقبال نے جن آیات کی یاد دلائی ہے اُن میں چند درج ذیل ہیں:۔

"دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اُس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ (لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ) ..... اب اگر یہ لوگ تم سے مُنہ پھیرتے ہیں، (فَإِن تَوَلَّوْا)، تو اے نبیؐ، اِن سے کہدو کہ: "میرے لئے اللہ بس کرتا ہے" (فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ)، کوئی معبود نہیں مگر وہ (لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ) اُسی پر میں نے بھروسہ کیا (عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ)، اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا (وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ)" — (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۶)

"(اے نبیؐ)، تم اِن سے صاف کہہ دو کہ: "میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بُلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"

— (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۱۲)

"(اے نبیؐ)، کہو: "اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمہ دار تم۔ اُس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے (وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا)۔ ورنہ رسول کی ذمہ داری اِس سے زیادہ کچھ

نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔ (سورۃ النور ۲۴۔ آیت ۵۴)

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود اُنہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اُس کی آیات انہیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اُس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

— (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۷)

بتیسویں بند کے آخری شعر کے دوسرے مصرعہ: "دہر میں اِسمِ محمّدؐ سے اُجالا کر دے"۔ میں "اُجالا" سے مُراد وہ روشنی ہے جس کے متعلق سورۃ "یوسف ۱۲ کے رکوع ۱۲ کی مندرجہ بالا آیات میں خود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ: "میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی"۔ اقبالؔ اِسی روشنی میں خود راستہ دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے کی تلقین کرتے ہیں۔ رسول اللہ کے پیرو ہونے کی وجہ کر "بشیری اور نذیری" کے فرائض انجام دینا ہر مومن کا فرض ہے۔ اور اِسی اُجالے کو جو اِسمِ "محمّدؐ" کے مترادف ہے اقبالؔ نے "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گُل افغان کے افکار" کے پندرہویں بند کے آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے:۔

اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری!

"اِسمِ محمّدؐ" سے پیدا شدہ اُجالے پر اقبالؔ جیسے عاشقِ رسولؐ سے کچھ اور بھی ذہن نشیں کرتے چلے"۔ بالِ جبریلؔ" کی نظم: "ذوق و شوق" کے چوتھے بند میں اِس "اُجالے" کو ملاحظہ فرمایئے:۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مُراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب!
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے!

طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے!

چونتیسواں بند

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

یہ پورا بند سورۃ "اَلَمْ نَشْرَحْ ۹۴" کی تفسیر ہے۔ یہ سورۃ مکی دور میں ایسے وقت میں نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفعِ ذکر، یعنی دعوتِ حق پہنچانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور کفار اور مشرکین آپؐ اور آپ کے ساتھیوں کی صرف شدید ترین مخالفت ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اسلام قبول کر لینے کی وجہ کر بدترین اذیتیں بھی دے رہے تھے۔ اگر کوئی ڈھارس دلانے والا نہ ہو تو ایسی حالت میں بشری کمزوری کسی بھی انسان کی ہمت توڑ سکتی ہے۔ اِس لئے خدائے تعالیٰ نے آپؐ کو یہ سورۃ نازل کر کے تسلّی بخشی کہ آزردہ خاطر ہونے کی بات نہیں۔ ہم نے تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا (وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ) اور مزید تسلّی کے لئے اس فقرہ کو دوبارہ دُہرایا کہ: "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے (فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا)۔

اقبالؔ اِس بند کے آخری شعر میں اِس آیت "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کی تلمیح لا کر مسلمانوں کو ایک تو یہ تلقین کرتے ہیں کہ خدا کا کہنا کتنا صحیح ہے کہ آج دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں، بحر میں، موجوں کی آغوش میں طوفان میں، چین کے شہر میں، مراقش (افریقہ کا ایک اسلامی ملک ہے جسے انگریزی میں "مورکو" کہتے ہیں) کے بیاباں میں غرض ہر طرف اس ذکر کا آوازہ بلند ہو کر رہا اور اتباعِ رسول اللہؐ مسلمانوں کے ایمان کا جزو بن کر رہا۔ دوسری بات یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جب یہ تمہارے ایمان کا لازمی جزو ہے تو تمہارے لئے بھی تنگی کے بعد فراخی کا دور آئے گا بشرطیکہ تم سچے عاشقِ رسولؐ بنو۔

آج اِس آوازہ کے بلند ہونے کا ثبوت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دُنیا کے ۱۵ آزاد و مختار ملک

ہیں آج چھیالیس مسلم ممالک ہیں جہاں اس آوازہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اتنے ہی اور ممالک ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں مگر صدائے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" وہاں بھی گونجتی ہے۔ "رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" کا نظارہ ایک جگہ دیکھنا ہو تو مکہ مکرمہ کے مسجدِ حرام میں اوپر کی منزل سے خصوصاً مغرب بعد ہزار ہا ہزار بجلی کے قمقموں کی روشنی میں حج کے موقع پر بیس پچیس لاکھ کلمہ گویوں کو ایک جگہ دیکھئے اور ان میں سے ہزار ہا ہزار کو ہر وقت خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ملاحظہ فرمایئے اگر اس نظارہ کو دیکھ کر خوشی کے مارے آنکھیں نم ہو جائینگی تو ذرا سنبھلنے پر اقبالؔ کا یہ شعر برجستہ زبان پر آجائے گا ؎

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

پینتیسواں بند

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دُنیا — وہ تمہارے شہدا پالنے والی دُنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ ، ہلالی دُنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دُنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کیطرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کیطرح

اِس بند میں "کالی دُنیا" سے مُراد ملک حبشہ ہے جہاں کے لوگ کالے ہوتے ہیں اور یہی وہ ملک ہے جہاں کے بادشاہ نجاشی نے، عیسائی ہوتے ہوئے، رسول اللہ کے مکی دور میں مکہ سے ہجرت کرنے والے ایک چھوٹے سے قافلہ کو پناہ دی تھی۔ اس بند میں بھی اقبالؔ نے "قوتِ عشق" کا ہی نکتہ ذہن نشین کرایا ہے اور اسی کو "بلالی دنیا" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت بلالؓ پر سولہویں بند میں تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

چھتیسواں بند

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری — میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
غیر اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری — تو مسلماں ہو تو، تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اِس آخری بند میں اللہ مسلمانوں سے یہ خطاب فرماتا ہے کہ ہم نے تجھے عقل کی دولت بھی دی ہے اور عشق کی طاقت بھی۔ تو عقل کو ڈھال بنالے اور عشقِ رسولؐ کو تلوار۔ راستے میں جو مشکلات پیش آئیں اُنہیں عقل کی مدد سے دور کرا ور دُنیا میں ہمارے محبوبؐ کا نام بلند کر۔ اگر تو حقیقی معنوں میں مومن ہو جائے تو پھر تیری تدبیر ہماری مشیّت سے ہم آہنگ ہو جائے گی اور تیری ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔ اور پھر آخری شعر میں جو صرف اِس بند ہی کا نہیں بلکہ پوری نظم "جوابِ شکوہ" کلیدی شعر ہے پورے قرآن کی تلخیص رکھ دی گئی ہے یعنی "عشقِ رسولؐ میں گردیدگی" اور آپ کی مکمل "اطاعت"۔ جس کے نتیجے میں اِس دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے ہم تمہیں ساری کائنات کا مالک بنادیں گے۔

اِس بند کے دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ درجِ ذیل آیت کا ترجمان ہے :۔

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردے اور عملاً وہ نیک ہو، اُس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے" ـــ (سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۲۲)

اِس بند کے آخری شعر میں جو ساری نظم "شکوہ" کا جواب ہے اقبالؔ ایک مومن کے ایمان کی اُس منزل کا پتہ دیتے ہیں جہاں پہنچ کر اُس کے لئے اُس کی "خلافت" "جہانگیر" بن جاتی ہے۔ اِس شعر میں اقبالؔ نے جو ہو بہو درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہدو کہ : "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اِن سے کہو کہ : "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اُس کی اور اُس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں" ـــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۴)

مندرجہ بالا آیات میں خدا کا یہ فرمانا کہ : "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو" درجِ ذیل آیت کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے :۔

" ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِیْنَ

اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ) ـــــ (سورۃ البقرہ ۲ ۔ رکوع ۲۰)

اقبالؔ اِس آخری شعر میں یہی نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اللہ سے گرویدگی بذاتِ خود، قرآن کی رو سے کوئی معنی نہیں رکھتی اگر کوئی شخص "اتباعِ رسولؐ" سے منحرف ہو۔ سورۃ آلِ عمران ۳ کی مندرجہ بالا آیات کا پہلا فقرہ شرطیہ ہے اور "اگر" سے شروع ہوتا ہے اور "تو" سے فقرہ پورا ہوتا ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے بھی پہلے مصرع میں "کی" اور "تو" ہی استعمال کیا ہے جیسا فرمانِ باری ہے۔ مطلب یہ کہ "اتباعِ رسولؐ" خود بخود اُسے اللہ کا گرویدہ بنا دیتی ہے۔ اِسی نکتہ کو قرآن میں مختلف مواقع پر ذہن نشیں کرایا گیا ہے جیسے :۔

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ)" ـــــ (سورۃ النسآء ۴ ۔ رکوع ۱۱)

"(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے) جو اس پیغمبرِ اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی پیروی اختیار کریں ..... جو لوگ اِس پر ایمان لائیں اور اُس کی حمایت اور نُصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں، جو اُس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں ..... پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے بھیجے ہوئے نبیِ اُمّی پر جو اللہ اور اُس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، اُمید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے"

ـــــ (سورۃ الاعراف ۷ ۔ رکوع ۱۹ اور ۲۰)

اقبالؔ نے ۹۳ اشعار پر مشتمل نظم "شکوہ" لکھی اور ۱۰۸ اشعار میں "جوابِ شکوہ"۔ لیکن اگر وہ بجائے ۱۰۸ اشعار میں جواب دینے کے صرف اُس چھتیسویں بند کا آخری شعر لکھ کر عنوان : "جوابِ شکوہ" لکھ دیتے تو "شکوہ" کے ۹۳ اشعار کا جواب مکمل سمجھا جاتا۔ اور یہی شعر پورے "شکوہ" کا جواب بھی ہے۔

اقبالؔ اور تفضیلِ علیؓ

اقبالؔ نے اپنے کلام میں صحابۂ کرامؓ کے ناموں سے جہاں بہت سی اصطلاحات وضع کیں اُن میں حضرت علیؓ کا نام سرِفہرست ہے کیونکہ سب سے زیادہ اشعار، صحابۂ کرامؓ کی عقیدتمندی میں اُن کے اُردو کلام میں حضرت علیؓ پر ملتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے اقبالؔ کی یہ عقیدت مندی اُن کی طالبعلمی کے زمانہ ہی میں اُن کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اگرچہ اُس وقت تک نہ تو اُنہوں نے اپنے کلام میں مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا اور نہ کوئی شعر ہی حضرت علیؓ یا کسی صحابۂ کرامؓ پر ہی کہا تھا۔ مگر اُن کے ملنے جلنے والے اور رفقاء کے حلقے میں یہ چرچا عام تھا کہ اقبالؔ شیعہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں جب کہ وہ لاہور کے مقامی کالج میں تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد ابھی اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کو روانہ بھی نہ ہوئے تھے (یعنی ۱۹۰۵ء کے قبل) کہ اُنہوں نے نظم: "زُہد اور رِندی" لکھی جس میں صرف یہی نہیں کہ اپنے دینی اعتقادات کی ایک ہلکی سی جھلک لوگوں کو دکھائی بلکہ اِس نظم میں ایسے لوگوں کو جو بندھے ٹکے اعتقادات کو جزوِ ایمان سمجھ بیٹھتے ہیں اور دینِ اسلام کی روح سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے بھی اپنی دینی علمیت کا ڈھول پیٹتے پھرتے ہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ نظم، جو درجِ ذیل ہے، آج بھی باعثِ دلچسپی و عبرت ہے کیونکہ اس میں آج کے مُسلم معاشرے کے بہت سارے ایسے لوگوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔

اِک مولوی صاحب کی سُناتا ہوں کہانی	تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا	کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت	جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہو معانی

لبریز مے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مُریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسایہ میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پُرانی

حضرت نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبالؔ کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی

پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اُس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سُنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی

کچھ عار اُسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شُعرا کی ہے پُرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سُنا اپنے مُریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اُس کی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دِل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

رِندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

اِس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کُھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اِس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سُنی اپنے اَحبا کی زبانی

اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پُرانی

فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دِکھانی

میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قُربِ مکانی

خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں
کی اُسکی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

("بانگِ درا")

"عشق" اقبالؔ کے افکار و تصورات کا سب سے اہم جزو ہے جس سے اُن کی مُراد "عشقِ رسولؐ" ہے۔ اقبالؔ کی "عشقِ رسولؐ" میں گرویدگی پر تو لاتعداد اشعار ہیں مگر اس "عشق" کو وہ کیا کیا نام دیتے ہیں درجِ ذیل اشعار سے ذہن نشین کیجئے:۔

عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفےٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہِ حرم، عشق امیرِ جُنُود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

("بالِ جبریل": نظم: "مسجدِ قرطبہ")

اقبالؔ نے جہاں "عشق" کے اتنے سارے روپ بتائے ہیں وہاں اُن کے نزدیک ایک روپ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی ذات بابرکات بھی ہے۔ جیسے "بالِ جبریل" کی درجِ ذیل دو رُباعیوں میں دیکھئے:۔

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق!

کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ، خیبر شکن عشق

جمالِ عشق و مستی نَے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اقبالؔ کے افکار میں خودی، عشق اور فقر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے میں پردئے ہوئے ہیں جسے الگ الگ سمجھنا کسی کو "اقبالیات" کی تہہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ یہ بھی ایک دوسرے پر لازم وملزوم ہیں بلکہ ایک "مردِ مومن" کی شبیہہ انہی سے تشکیل پاتی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک خودی جب عشق سے مملو ہوکر فقر کی سان پر چڑھتی ہے تو اُس کے فتوحات کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ شانِ امارت میں بھی "سحان اَلفقرِ فَخرِی" کی مثالیں آج بھی ہمارے ایمان پر تازیانے لگتے اور درس عبرت دیتی رہتی ہیں۔ اقبالؔ کے "فقر" کا ماخذ قرآن ہے جسے اُنہوں نے دنیا سے انتہائی بے رغبتی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ انہی تصوّرات کے تحت حضرت علیؓ کے فقر کی شان اُنہوں نے یہ بتائی ہے کہ :-

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی !
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللّٰہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی !

("بالِ جبریل" : غزل ۳۴)

چونکہ اقبالؔ کے "فقر" کا ماخذ قرآن ہے اس لئے اُنہوں نے اپنے لڑکے جاویؔد اقبال کو (جو لندن میں زیرِ تعلیم تھے) جو ہدایت دی اور جس کا اطلاق عام مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اِس فقر سے آدمی میں پیدا — اللّٰہ کی شانِ بے نیازی !

("ضربِ کلیم" : "جاوید سے۔ ۳")

انہی تصوّرات کے تحت فقر کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبالؔ فقر کو "فولاد کی شمشیرِ جگر دار" سے مماثلت دے کر اُسے "حیدرِ کرّارؓ" کے مترادف قرار دیتے ہیں :-

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اِس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار !

ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ!
("ضربِ کلیم": "آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر")

اقبالؔ کو چونکہ حضرت علیؓ کے فقر میں "بوئے اسد اللہیؓ" نظر آئی اس لئے عام مسلمانوں کے لئے حضرت علیؓ کے حوالے سے خدا سے دعا گو ہیں کہ :۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر!
("بالِ جبریل": رُباعی)

اسی "نانِ جویں" اور "بازوئے حیدرؓ" کے نکتوں کو "بانگِ درا" کی نظم: "میں اور تو" (بعد از نظم شکیپیر) میں اس طرح بھی ذہن نشیں کراتے ہیں ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے، مدارِ قوتِ حیدریؓ

چونکہ اقبالؔ نے عشق کا روپ کبھی "مولا علیؓ خیبر شکن" اور کبھی "کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ" سے تعبیر کیا ہے اس لئے ذیل میں "کمالِ عشق و مستی" میں "ظرفِ حیدرؓ" کی چند مثالیں نقل کی جا رہی ہیں تاکہ ہم اقبالؔ کی حضرت علیؓ سے بے انتہا عقیدتمندی سے واقف ہو سکیں۔

ذرا خیال کیجئے عشق کا عالم اور اس کا تقاضا اور حضرت علیؓ کی جرأتِ رندانہ کہ جب مکّہ کے سرداروں نے خفیہ طور پر یہ طے کر لیا کہ آج محمدؐ کو قتل کر دیا جائے اور اس کی خبر حضور صلعم کو بذریعۂ وحی ہو گئی تو حضرت علیؓ نے خود یہ پیشکش کی آج رات ہم آپؐ کے بستر پر سو جائیں گے اور جب کفار گھر کے اندر قتل

کی نیت سے داخل ہوں گے تو آپؐ کو نہ پا کر ناکام واپس جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ (جنہیں صرف یہ بات بتا دی گئی تھی) رات ہوتے ہی چھپ کر غارِ ثور میں جا چھپے اور چند روز بعد مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے۔ اُس رات حضرت علیؓ آپؐ کے بستر پر محوِ خواب تھے کہ کفار اپنے پروگرام کے مطابق آپؐ کے گھر میں داخل ہوئے اور ناکام واپس گئے۔ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر رسولؐ کے عشق میں مر مٹنے کی تمنا ایک سچے عاشق کی ہی ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی عشق کی ترجمانی اقبالؔ نے اس شعر میں کی ہے ؎

بے جُرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی!

(ضربِ کلیم: "محرابِ گُل افغان کے افکار۔ بند۱۴")

اقبالؔ کے کلام میں حضرت علیؓ کے جذبۂ ایثار، بہادری، جانبازی اور جُرأتِ رندانہ پر بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ اُنہوں نے آپؓ کا نام نہ لے کر حیدر، حیدری، کرّار، کرّاری، خیبر شکن، اسداللّٰہی جیسے لقاب کو اصطلاحوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عشقِ رسولؐ میں جہاں حضرت علیؓ کی جانبازی اور جُرأتِ رندانہ کی بہت سی روایات منقول ہیں اُن میں ایک روایت غزوۂ اُحد کی بھی ہے۔ جنگِ بدر (رمضان ۲ھ) کے بعد کُفّارِ مکہ نے غزوۂ اُحد کا حملہ ۳ھ میں کیا تھا۔ کیونکہ جنگِ بدر میں اُنہیں شکست ہوئی تھی۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو کچھ شکست ہوئی تھی جس کی بڑی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد پر عمل نہ کرنا تھی۔ اس غزوہ میں نبی کریمؐ بھی کُفّار کے ایک جھتے کے بیچ میں آ گئے تھے اور کُفّار نے یہ مشہور کر دیا کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ اس خبر سے بہت پریشان حال تھے اور اسی وجہ سے بہت سے بھلے بھی اور اِدھر اُدھر متفرق ہو گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں:

"جب کُفّار نے مسلمانوں کو گھیر لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے حضورؐ کو اول زندوں میں تلاش کیا مگر نہ پایا۔ پھر شہدا میں جا کر تلاش کیا۔ وہاں بھی نہ پایا۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ حضور لڑائی سے بھاگ جائیں۔ اِس لئے اب اس سے بہتر کوئی صورت نہیں میں بھی تلوار لے کر کافروں کے جھتے میں گھس جاؤں یہاں تک کہ مارا جاؤں۔ میں نے تلوار لے کر حملہ کیا یہاں تک کہ کُفّار بیچ سے ہٹنے لگے اور میری نگاہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑ گئی تو بےحد

مسّرت ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے ملائکہ کے ذریعے سے اپنے محبوبؐ کی حفاظت کی۔ میں حضورؐ کے پاس جا کر کھڑا ہوا کہ کفّار کی ایک جماعت حضورؐ پر حملے کے لئے آئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "علیؓ، اِن کو روکو"۔ میں نے تنہا اِس جماعت کا مقابلہ کیا اور اُن کے مُنہ پھیر دئے اور بعضوں کو قتل کر دیا"۔ اِس کے بعد پھر ایک اور جماعت حضورؐ پر حملہ کی نیت سے بڑھی۔ آپؐ نے پھر حضرت علیؓ کی طرف اشارہ فرمایا۔ اُنہوں نے پھر تنہا اِس جماعت کا مقابلہ کیا۔ اِس کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے آکر حضرت علیؓ کی اِس جوانمردی اور مدد کی تعریف کی تو حضورؐ نے فرمایا: "اِنَّہٗ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ (بیشک علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں)" یعنی کمالِ اتحاد کی طرف اشارہ فرمایا تو حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ: وَ اَنَا مِنْکُمَا (میں تم دونوں سے ہوں)" —

(فضائلِ اعمال: حکایتِ صحابہؓ)

اُحد کی جنگ سے عام مسلمانوں میں اس جنگ میں شکست سے سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اِس لئے فرمایا خدائے تعالےٰ نے:-

"یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور اُن لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں"۔ — (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۴)

غزوۂ اُحد میں حضرت علیؑ کے جذبۂ قربانی پر اقبالؔ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

کھول کے کیا بیاں کروں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ با شرف، مرگ حیاتِ بے شرف!

("بالِ جبریل": غزل ۱۶)

حضرت علیؓ کی جانبازی اور بہادری پر دوسری روایت ۵ھ میں مدینہ سے بالکل متصل غزوہ

خندق کی ہے جسے "جنگِ احزاب" بھی کہتے ہیں :-

"ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عمرو بن عبدو اِس طرح پر نکلا کہ لوہے کی زرہ پہنے ہوئے تھا اور اُس نے بلند آواز سے کہا کہ "کون میرے مقابلہ کے لئے آتا ہے"۔ حضرت علیؓ ابن ابو طالب کھڑے ہوئے اور حضورؐ سے عرض کیا کہ: "میں اسکے مقابلے میں نکلوں؟"۔ آپؐ نے فرمایا: "وہ عمرو ہے، بیٹھ جاؤ"۔ دوبارہ پھر عمرو نے آواز دی کہ: "ہے کوئی آدمی جو میرے مقابلے کو نکلے؟" اور مسلمانوں کو ملامت کرنا شروع کیا اور کہنے لگا کہ: "تمہاری وہ جنّت کہاں ہے جس کے متعلق تم دعویٰ کرتے ہو کہ جو تم میں سے مارا جاتا ہے وہ اُس میں داخل ہو جاتا ہے۔ کیوں نہیں میرے مقابلے کے لئے کسی آدمی کو کھڑا کرتے ہو؟" -

حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر حضورؐ سے اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا: "بیٹھ جاؤ"۔ تیسری بار عمرو نے پھر وہی آواز دی اور کچھ اشعار پڑھے۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر حضورؐ سے عرض کیا کہ: "یا رسول اللہؐ! میں اِس کے لئے نکلوں گا"۔ آپؐ نے فرمایا کہ: "یہ عمرو ہے"۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا: "وہ عمرو ہے میں علی ہوں"۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اجازت دے دی۔ حضرت علیؓ چل کر اُس کے پاس پہنچے اور آپؓ یہ رجز پڑھ رہے تھے :-

لَا تعجلن فقد اتاك (۱) مُجیب صوتك غیر عاجز
فی نیة و بصیرة (۲) وَالصدق منجی کل فائز
انی لارجوان اقیم (۳) علیكَ نائحة الجنائز
من ضربة نجلاء (۴) یَبْقیٰ ذکرها عند الهزاهز

(۱) جلدی نہ کر، تیرے پاس تیری آواز کا جواب دینے والا، جو عاجز نہیں ہے، آگیا۔
(۲) سچی نیّت اور بصیرت کے ساتھ اور سچائی ہی نجات دیتی ہے ہر کامیاب ہونے والے کو۔
(۳) مجھے قوی اُمید ہے کہ میں تیرے اوپر جنازے پر نوحہ کرنے والیوں کو قائم کردوں گا۔
(۴) ایسی ضربِ وسیع کے ذریعے کہ جس کا تذکرہ ہر نقل و حرکت کرنے والے میں باقی رہ

جائے گا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی جبکہ کفار کا لشکر جو بیس ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا اور مسلمان محدود تعداد میں تھے۔

اقبال نے جہاں حضرت علیؓ کو اُن کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بہت سے القاب سے نوازا ہے، جیسے حیدر (بمعنی شیرِ نر)، کرار (بمعنی دشمنوں کی صف میں بے خوف و خطر برابر حملہ کرنے والا)، وہاں اُنہوں نے ایک اصطلاح "خیبر شکن" بھی وضع کی جو حضرت علیؓ کے اپنے محبوبؐ کی پکار پر لبیک کہنے کی لازوال مثال ہے۔ خیبر کی جنگ ۷ھ میں ہوئی تھی جہاں کا سردار مرحب یہودی تھا۔ اقبال نے اِسی غزوۂ خیبر کی مثال دے کر مسلمانوں کی موجودہ حالت پر اِس طرح اظہارِ تاسف کیا ہے ؎

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

("بالِ جبریل": غزل ۴۳)

خیبر کی جنگ بھی دین و وطن کی معرکہ آزمائی تھی مگر اُس وقت دشمنانِ دین کا صرف ایک گروہ یہودیوں کا اِس دین سے برسرِ پیکار تھا۔ مگر آج مسلمانوں کو دنیا کے مختلف گروہوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس وقت تو حضرت علیؓ جیسے "حیدرِ کرار" تھے جنہوں نے باطل پر فتح پائی اور حق غالب رہا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں میں آج کوئی ایسا جانباز اور عشقِ رسول میں گرویدگی رکھنے والا نہیں رہا جو باطل کا مقابلہ کر سکے۔ عشقِ رسول میں گرویدگی تو اقبال کے یہاں یہ ہے کہ :-

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

("ضربِ کلیم": "امامت")

اقبال دوسری جگہ غزوہ خیبر کی مثال دے کر فرماتے ہیں کہ حق و باطل کی یہ معرکہ آرائی کوئی نئی بات

نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے فطرتِ اسد اللٰہی" (اقبالؔ کی اس سے مُراد حضرت علیؓ کی فطرت یعنی اللہ کے شیر سے ہے) پیدا کرنے کی ہے ورنہ مرحبی اور عنتری (مرحب کا بھائی جسے حضرت علیؓ نے غزوۂ خیبر میں میدانِ جنگ میں قتل کیا تھا)۔ جو خیبر کے سردار تھے تو ہر زمانہ میں حق کے خلاف صف آرا رہے ہیں سکتے ہیں ؂

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجۂ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

("بانگِ درا": نظم "میں اور تو"۔ بعد از نظم "شیکسپیر")

"بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" میں اگر مسلمانوں کو اپنی زبوں حالی پر خدا سے یہ شکایت تھی کہ ؂

تو ہی کہدے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا، اُس کو کیا سر کس نے؟

("نواں بند")۔ (دیکھیں ضمیمہ نمبر ۲)

تو اس کا جواب نظم "جواب شکوہ" میں اُنہیں یہ ملا کہ :۔

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے | تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے | تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

(بیسواں بند)

اقبالؔ نے اِس بند میں مسلمانوں کے دعویٰ ایمان پر بھرپور چوٹ لگاکر یہ اعتراف تو کیا کہ تاریخ اس پر شاہد ضرور ہے کہ مسلمانوں نے درِ خیبر اُکھاڑا تھا مگر وہ "مسلمان تھے"، صرف اقرار باللسان تک ایمان کو محدود نہ رکھتے تھے بلکہ اُن میں حضرت علیؓ کا فقر اور حضرت عثمانؓ کی ایثار و قربانی کارفرما تھی جو تمہاری طرح تارکِ قرآں نہ تھے بلکہ "اندازِ مسلمانی" یعنی سچے عاشقِ رسولؐ کہے جانے کے حامل تھے۔ وہ تم جیسے "مستِ مئے ذوقِ تن آساں" نہ تھے اور خدا اور اُس کے رسولؐ کی خاطر مرحب جیسے سردار سے نبرد آزما ہوکر نتائج سے بے پروا اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا حاصلِ ایمان سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے موقع پر بھی حضرت علیؓ کے جذبۂ ایمانی پر اقبالؔ

اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ؎

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی
("بالِ جبریل": نظم "ایک نوجوان کے نام")

اقبال مسلمانوں کو جس "خیبر شکن" ایمان کی تلقین کرتے ہیں اُسے اگر روایات کے پس منظر میں ذہن نشین کیا جائے تو یہ نکتہ زیادہ واضح ہو جائے۔ جنگ خیبر جو ساتویں صدی ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکردگی میں عرب کے یہودیوں کے خلاف لڑی گئی ہے اسے اسلامی تاریخ میں اس لئے بڑی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اسی جنگ کے بعد مسلمانوں کے عروج کی ابتدا ہوئی اور اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد مسلمانانِ مدینہ جزیرہ نمائے عرب کی اتنی بڑی طاقت بن گئے کہ پھر اُن سے کفارِ مکہ آنکھ نہ ملا سکے اور نہ منافقینِ عرب ہی اُن کا مقابلہ کر سکے۔ خیبر مدینہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جہاں یہودی برسرِ اقتدار تھے۔ وہ کھُلے میدان میں لڑنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے اس لئے اُنہوں نے چھ سات نہایت ہی مضبوط اور سنگین قلعے تعمیر کرا رکھے تھے جن میں دورانِ جنگ محصور ہونے کے بعد قلعوں کے دروازے بند کر لئے گئے تھے جن قلعوں میں قریب بیس ہزار فوج تھی۔ یہودیوں کی توقع کے خلاف مسلمانوں نے ایک کے بعد ایک قلعہ فتح کرنا شروع کر دیا جب دو کی فتح میں دیر ہوئی تو رسول اللہ نے فرمایا کہ: "کل میں اس شخص کو عَلَم دونگا جس کے ہاتھ پر حق تعالے ان قلعوں کو فتح کرائے گا۔"

دوسرے روز جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے روایت ہے کہ مرحب (یہودی سردار) نکلا۔ وہ اپنی تلوار لے کر اکڑتا ہوا چل رہا تھا اور کہہ رہا تھا:۔

قد علمت خیبر انی مرحب   شاکی السلاح بطل مجرب
اذا الحروب اقبلت تلھب

ترجمہ:۔ "تمام خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔ ہتھیار سے لیس ہوں۔ بڑا تجربہ کار پہلوان ہوں جب لڑائیاں لپٹ مارتی ہوئی سامنے آتی ہیں۔"

مرحب کا مقابلہ پہلے حضرت عامرؓ نے کیا مگر وہ اُس کے ہاتھوں جب شہید ہوگئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو آدمی بھیجکر بلایا۔ اُن کی آنکھیں اس وقت دُکھ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ: "آج میں ایسے آدمی کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول کو دوست رکھتا ہے" حضرت سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں کہ: میں حضرت علیؓ کو آپ کے پاس سہارا دے کر لایا۔ آپ نے اُنؓ کی آنکھ میں لعاب دہنِ مبارک لگایا اور اُنہیں فی الفو

شفا ہو گئی۔ پس آپؐ نے اُن کو جھنڈا دیا۔ اُدھر مرحب نے پھر تکل کر وہی کہنا شروع کیا جو اس نے حضرت عامرؓ کے مقابلے میں بھیجے جانے کے قبل مسلمانوں کو للکارا تھا۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں کہ :۔

"اس (مرحب) کے مقابلہ کے لئے حضرت علیؓ نکلے اور آپؓ یہ شعر پڑھ رہے تھے :۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　کلیث غابات کریہ المنظرہ

اونیھم بالصاع کیل السندرہ

ترجمہ :۔ میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر (حیدر) رکھا ہے۔ جھاڑیوں کے شیر جیسا ۔ دیکھنے میں خوفناک ہوں۔

میں اُن کو پورا پورا بڑا صاع ناپ دوں گا جیسے سندرہ کی ناپ۔ یعنی میں اُن کو قتل کر دوں گا۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے مقابلہ کیا اور قلعہ کے قریب پہنچے اور مرحب پر ایک وار کیا اور اُس کا سر پھاڑ کر اس کو قتل کر دیا۔ اس طرح خیبر فتح ہوا"

("حیاۃ الصحابہؓ" ۔ حصہ سوم)

اسی واقعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ابو رافع نے تفصیلی طور پر اس طرح روایت کیا ہے کہ :۔

"جب حضرت علیؓ جھنڈا لے کر قلعہ کے قریب ہوئے تو قلعہ کے لوگ اُنؓ کی طرف نکلے۔ حضرت علیؓ نے اُن سے جنگ کی۔ ان میں سے ایک یہودی نے حضرت علیؓ کو تلوار ماری۔ اُن کے ہاتھ سے ڈھال گر گئی۔ حضرت علیؓ نے قلعہ کا پھاٹک ہاتھ میں لے کر اس کو ڈھال بنا لیا۔ یہ پھاٹک اُن کے ہاتھ میں برابر رہا اور یہ لڑتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے اُنؓ کے ہاتھوں خیبر کو فتح کیا۔ اس کے بعد اُس پھاٹک کو اپنے ہاتھ سے ڈال دیا۔"

(حیاۃ الصحابہؓ ۔ حصہ سوم)

اقبالؔ جب حضرت علیؓ کے حوالے سے "بازوئے حیدرؓ"، "زورِ حیدریؓ"، جیسی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں تو اِن کی عقبی زمین اِن روایات سے تشکیل پاتی ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا اور کچھ حضرت ابو رافعؓ کی درجِ ذیل روایت میں ملتا ہے :۔

"میں (حضرت ابو رافعؓ) اپنے آپ کو مع سات آدمیوں کے اِس بات کی کوشش کرتے

ہوئے دیکھا کہ اِس پھاٹک کو ہم پلٹ دیں۔ نہیں طاقت نہ تھی کہ ہم اِس کو پلٹ دیں۔
حضرت علیؓ نے اِس کے بعد تجربہ کیا تو چالیس آدمی بھی اُسے نہ اُٹھا سکے۔ ایک روایت
میں ہے کہ ستّر آدمیوں نے اس کے بعد اس کے پلٹنے کی کوشش کی مگر بڑی مشقت محسوس
کی" ـــــ ("حیاۃُ الصحابہؓ" "حصّہ سوم")

اقبالؔ کی مُراد "بازوئے حیدرؓ" اور "زورِ حیدریؓ" سے جسمانی طاقت نہیں بلکہ وہ ایمانی طاقت ہے جو ہر مشکل کو آسان کردیتی ہے اور ہر باطل کے مقابلے میں فتح وکامرانی سے سرفراز کرتی ہے۔ اور ایسی ہی فتح کو اقبالؔ نے اِس مصرعہ میں ذہن نشیں کرایا ہے کہ: "بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی"۔ اقبالؔ نے جب نظم: "زُہد اور رندی" میں مولوی صاحب سے یہ کہا تھا کہ: "گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی"، تو اِس سے اُن کی مُراد "تفضیلِ علیؓ" کے معاملہ میں یہ ساری روایات تھیں جو اب تک اِس مضمون میں گزری ہیں۔ "تفضیلِ علیؓ" کو اپنے ایمان کا جزو بنا کر اقبالؔ نے مسلمانوں کے تنِ بے روح میں" اندازِ مُسلمانی" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جس کے متعلق حضرت عبداللّٰہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ:۔

"اللّٰہ تعالیٰ ابوالحسن (حضرت علیؓ) پر رحم فرمائے۔ خُدا کی قسم وہ ہدایت کا پرچم، تقویٰ کا غار، عقل کا محل، حُسن کا ٹیلہ تھے۔ رات کی تاریکیوں میں چلنے والے کے لئے نور تھے۔ بڑے کُشادہ راستہ (یعنی دینِ الٰہی) کی طرف بُلانے والے تھے۔ جو کچھ پہلے صحیفوں میں آیا ہے اُس کے عالِم وعظ و نصیحت کے ساتھ دائم وقائم۔ اسبابِ ہدایت کے ساتھ چمٹنے والے ظُلم واذیت کے تارک تھے۔ ہلاکت کی راہوں سے برطرف تھے۔ ایمان لانے والے اور پرہیزگار لوگوں میں سے بہترین تھے۔ ہر کُرتہ اور چادر پہننے والے کے سردار اور حج وسعی کرنے والوں میں سے افضل تھے۔ اور ہر عدل و مساوات کرنے والے سے زیادہ جواں مرد تھے۔ اور علاوہ محمد مصطفٰے صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کے دُنیا بھر سے زیادہ بہتر۔ آپؓ خطیب تھے۔ آپؓ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے بیت المقدس اور بیت اللّٰہ کی طرف نمازیں پڑھیں۔ آیا کیا کوئی اُن کی برابری کرسکتا ہے؟ اور خیر النساء عالم حضرت فاطمہ زُہرا رضی اللّٰہ عنہا سے شادی کی۔ آنحضرتؐ کے دونوں نواسوں کے

آپؓ والد تھے۔ نہ تو میں نے ان جیسا کسی کو دیکھا اور نہ میری آنکھیں ان جیسا قیامت تک دیکھیں گی۔ جو حضرت علیؓ پر لعنت بھیجے اُس پر اللہ اور اللہ کے بندوں کی قیامت تک لعنت ہو" ("حیاۃ الصحابہؓ۔ حصہ اول)

اقبالؔ جب خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے

اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

یا مسلمانوں کو یہ تلقین کراتے ہیں ؎

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدریؓ

یا "حیدریؓ فقر" کی باتیں کرتے ہیں تو اُن کے ذہن میں حضرت علیؓ پر "نانِ جویں" اور "نانِ شعیر" پر بہت سی روایات رہی ہوں گی جن میں ایک درج ذیل ہے، جو حضرت عطاؒ سے مروی ہے کہ :-

"مجھے معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: "ہم پر کئی دن ایسے گزرے کہ نہ تو ہمارے پاس نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی چیز تھی۔ میں نکلا جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک دینار پڑا ملا۔ تھوڑی دیر تو میں نے سوچا کہ اُسے اُٹھاؤں یا نہ اُٹھاؤں۔ آخر کو میں نے اُسے لے لیا کیونکہ بڑی مشقت میں مبتلا تھا۔ اُسے لے کر دوکاندار کے پاس آیا اور آٹا خرید کر حضرت فاطمہؓ کے پاس لے گیا۔ اور میں نے کہا کہ: "اسے گوندھ اور روٹی پکالے"۔ اُنھوں نے گوندھنا شروع کر دیا۔ بھوک کی وجہ سے اُن کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اُنؓ کی پیشانی کے بال لگن تک پہنچ رہے تھے۔ بہرحال اُنہوں نے روٹی پکائی۔ ہم نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بات کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا: اسے کھالو۔ اللہ پاک نے تم کو یہ رزق دیا ہے"۔ ("حیاۃ الصحابہؓ۔ حصہ دوئم)

شاید اقبالؔ کے ذہن میں ایسے ہی مولوی صاحبان رہے ہوں جنہوں نے اُن سے یہ شعر کہلوایا ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دُو رکعت کے امام!

(ضربِ کلیم: "توحید")

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبالؔ کا مطمحِ نظر اپنی شاعری سے اعلیٰ روحانی حقائق کا اثبات تھا جسے اُنہوں نے مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرایا۔ اِس مضمون میں اُن کے ایسے ہی چند اشعار پیش ہیں جن کا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا جا رہا ہے:۔

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!

("بالِ جبریل"، رباعی قبل از نظم "مسجدِ قرطبہ")

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہیدِ کلیم اللّٰہی

("بالِ جبریل": غزل، ۵)

متذکرہ بالا رُباعی میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ عارفوں (یعنی اللہ والوں اور اولیاء کرام) کی صحبت انسان کے حق میں "نسیمِ صبح" کا حکم رکھتی ہے اور اُن کی صحبت سے اُسے وہی تر و تازگی ملتی ہے جو صبح کی ٹھنڈی ہوا سے۔ اُنہی کی صحبت کی بدولت انسان پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور روحانی تربیت کی آب یاری ہوتی ہے۔ اگر صحبتِ مرشد کا سلسلہ ختم ہو جائے تو "باغِ معانی" ویران ہو جائے، دل کے سوتے خشک ہو جائیں اور نفس مُردہ ہو جائے جس طرح پانی نہ ملنے اور موافق آب و ہوا نہ رہنے پر پودوں کی نمی ختم

ہو جاتی ہے۔

اسی کلیّہ کو جو اقبالؔ نے اِس رُباعی کے پہلے شعر میں مُرتّب کیا ہے دوسرے شعر میں مثال درکار ہے تو حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا مطالعہ کرو، انہیں چند سال تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرانے (شبانی) کا موقع ملا جس سے اُنہیں ایک عارف کی صحبت نصیب ہوئی جس کا فیض یہ ہوا کہ انہیں اِس شبانی نے کلیمی (یعنی پیغمبری) کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ مطلب یہ کہ صُحبت مرشد میں وہ تاثیر ہے کہ اِس کی بدولت ایک معمولی آدمی بھی اعلیٰ مرتبہ یعنی شرف مکالمت الٰہیّہ حاصل کر سکتا ہے۔

متذکرہ بالا غزل کے شعر میں اقبالؔ قافلہ سالاروں یعنی مُسلم قوم کے رہنماؤں پر طنز کرتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں تو وہ پاکیزگی نظر ہی نہیں آتی جو ان کو انعامات الٰہیّہ کا مستحق بنا دے۔ یہاں "شبانی" سے مراد ترکِ علائق دنیوی یا شانِ فقر اور "تمہیدِ کلیم اللّٰہی" سے مُراد نزولِ رحمت باری ہے۔

اِن سارے اشعار سے اقبالؔ در پردہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچانے کے لئے تزکیہ نفس ضروری ہے اور اس تزکیہ نفس کے لئے "دمِ عارف" یعنی اولیا کرام کی صُحبت اور اُن کی تقلید ضروری ہے۔ مگر اب جب کہ ہمارے سامنے قرآن جیسا عالی مرتبت کلام موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ پیشِ نظر ہیں تو "اتباعِ رسولؐ" ہی "دمِ عارف" کا متبادل ہے اور اسی کی پیروی کسی انسان کو کلیمی یعنی اعلیٰ مرتبہ عطا کر سکتی ہے۔ اِسی نکتہ کو اِسی "شبانی" اور "کلیمی" کی اصطلاحوں میں ایک اور نظم میں اقبالؔ نے اِس طرح بھی ذہن نشیں کرایا ہے :-

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مُشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سِرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز!

("ضربِ کلیم" : "خودی کی تربیت")

یہاں "ہوائے دشت" سے مُراد پاکیزہ زندگی، "شعیب" سے مُراد خدا رسیدہ انسان اور موجودہ اُمّت کے لئے رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات اور "شبانی" سے مُراد اتباعِ رسولؐ ہے۔

اقبالؔ اپنے کلام میں کسی ایک لفظ یا کسی ترکیب یا دو چار لفظوں کے اجتماع سے بہت سارے قرآنی

تصورات اور قرآنی قصوں کو کوزہ میں بند کر دیتے ہیں اور یہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ قرآن سے اُن کی کڑیاں ملا ملا کر قرآنی تصورات کے سمندر میں غوطے لگائے اور اُس گہر کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کو انہوں نے اِس کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ایسی ہی بات متذکرہ بالا اشعار میں "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے" میں ملتی ہے۔ اس مضمون میں انہی کڑیوں کو ملا کر اقبالؔ کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں اُسے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبالؔ نے اپنے اُردو کلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام دو ایک بار ہی لیا ہے مگر "کلیم"، "کلیم اللہ" "کلیمی" اور "کلیم الٰہی" جیسی اصطلاحات سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے۔ اِس لئے اِن اصطلاحوں میں روحانیت کے وہ اعلیٰ اقدار ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شایانِ شان ہیں۔ موسیٰ قبطی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "پانی سے نکالا ہوا"۔ قدیم مصری زبان میں "مو" پانی کو کہتے تھے اور "اوشے" کا مطلب تھا "بچایا ہوا"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پانی سے نکال کر فرعون کے محل میں پرورش پانے کی تفصیل سورۃ القصص ۲۸ کے رکوع میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "کلیم" اِس لئے کہا جاتا ہے چونکہ خُدا خود فرماتا ہے :-

"جب وہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر (کوہِ سینا پر) پہنچا اور اُس کے رب نے اس سے کلام کیا (وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ) تو اُس نے التجا کی کہ:
"اے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں"

—— (سورۃ الاعراف ۷، رکوع ۱۷)

پھر اسی سورۃ "الاعراف" کے اسی رکوع ۱۷ میں متذکرہ بالا آیت کے بعد فرمایا خدا تعالےٰ نے :-

"اے موسیٰؑ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے (بِرِسٰلٰتِیْ) اور مجھ سے ہم کلام ہو (وَبِكَلَامِيْ) پس جو کچھ میں تجھے دوں اُسے لے اور شکر بجا لا"

اِس سے بھی واضح طور پر سورۃ "النساء ۴" کی آیت ۱۶۴ میں فرمایا گیا ہے کہ :-

"ہم نے موسیٰؑ سے اِس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے (وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا)"۔

اب اِن تمہیدی اشاروں کے بعد وہ کڑیاں ملا کر ایمان کی وہ زنجیر بنائے جسے اقبالؔ نے صرف دو مصرعے یعنی : "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے" اور "بنوائے دشت و شعیبؑ و شبانیٔ شب و روز" کے کوزوں

میں بند کر دیا ہے۔ حضرت شعیبؑ کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے۔

"اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخر کے اُمیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹- آیت ۳۶)

حضرت شعیب علیہ السلام کے مدین والوں کی طرف مبعوث کئے جانے کی تفصیل "سورۃ الاعراف" رکوع ۱۱ میں بھی مذکور ہے۔ مدین کا علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیجِ عقبہ کے کنارے پر واقع تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ مدین کے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے صاحبزادے مدیان سے منسوب ہیں جو آپؑ کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اور اسی لئے یہ لوگ مدین والے کہلانے لگے۔ یہ ابتداءً مسلمان تھے مگر بعد میں بگڑ گئے۔ اِسی لئے حضرت شُعیب علیہ السّلام اس قوم اور خطے میں مبعوث کئے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بعد اور حضرت شعیب علیہ السّلام کے مدین آنے تک تقریباً چھ سو سال کا وقفہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی اور آپؑ کا نام موسیٰ بھی فرعون اور اُس کی بیوی ہی نے رکھا تھا۔ آپؑ کی پیدائش اور اُس کے بعد کے واقعات اور فرعون کے محل میں پرورش پانے کی تفصیل سورۃ "القصص ۲۸" کے رکوع ۱ میں وارد ہوئی ہے۔

مصر میں سنِ بلوغ کو پہنچنے پر ایک شخص کو، جو دُشمنِ قوم سے تعلق رکھتا تھا، قتل کر دینے کے بعد سزا سے اپنی جان بچانے کے لئے آپؑ کے مصر سے بھاگنے کا قصہ اِسی سورۃ کے رکوع ۲ میں اور بھاگ کر مدین کی طرف رُخ کرنے اور وہاں پہنچنے پر شبانی کے کام پر ملازمت کرنے کی تفصیلات رکوع ۳ میں درج ہیں۔ گرچہ ان حوالوں میں حضرت شعیب علیہ السّلام کا نام کہیں نہیں لیا گیا ہے اور نہ کہیں یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے حضرت شعیب علیہ السّلام کی بکریاں چرانے کے لئے دس سال تک ملازمت کی مگر اقبال کے مندرجہ بالا اشعار انہی آیات پر مبنی ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

"(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ علیہ السّلام نے مَدیَن کا رُخ کیا تو اُس نے کہا: "اُمید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔" اور جب وہ مَدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور اُن سے

الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰؑ نے اُن عورتوں سے پوچھا: "تمہیں کیا پریشانی ہے؟"۔ انہوں نے کہا: "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں"۔ یہ سُن کر موسیٰؑ نے اُن کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر ایک سائے کی جگہ بیٹھا اور بولا: "پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اُس کا محتاج ہوں"۔ (کچھ دیر گزری تھی کہ) اُن دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور کہنے لگی: "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لئے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اُس کا اجر آپ کو دیں"۔ موسیٰؑ جب اُس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اُسے سُنایا تو اُس نے کہا: "کچھ خوف نہ کرو، اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو"۔ (سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۳)

اب اِس کے آگے اِسی رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اُن عورتوں کے والد کی بکریاں چرانے (شبانی) کے واسطے ملازمت کرنے اور اُس کی شرائط اور آپؑ کی شادی کا بیان فرمایا گیا ہے:-

"اِن دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا: "ابا جان، اِس شخص کو نوکر رکھ لیجئے، بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو"۔ اُس کے باپ نے (موسیٰؑ سے) کہا: "میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو، اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے"۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ اِن دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دوں اُس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو، اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اُس پر نگہبان ہے"۔

یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی "شبانی" کا قصہ۔ اب دو قدم آگے "کلیمی" کی طرف چلئے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ:-

"جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب

اُس کو ایک آگ نظر آئی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا: "ٹھیرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اُس آگ سے کوئی انگارہ ہی اُٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو"۔ وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطّے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ: "اے موسیٰ، میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک"۔ اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جوں ہی کہ موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اُس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا): موسیٰؑ، پلٹ آ، خوف نہ کر (يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ) تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ اور خوف سے بچنے کے لئے اپنا بازو بھینچ لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے، وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔" موسیٰؑ نے عرض کیا: "میرے آقا، میں تو اُن کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے، اور میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اُسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ تائید کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔" فرمایا: "ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہوگا"

— (سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۴)

آگ کی تلاش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قدم "شبانی" کے بعد "کلیمی" کی طرف بڑھنے پر مندرجہ بالا آیات کی ترجمانی اقبالؒ کے اس شعر میں ملاحظہ کیجیے جو استفہامیہ انداز میں ہے اور "کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی" سے خودی کا "دمِ عارف" کی وجہ کر اپنے مرتبۂ کمال تک پہنچنے کی وجہ کر کشش کا نکتہ ذہن نشین کیجیے۔

کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰؑ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

("بانگِ درا": غزلیات حصہ اوّل)

اور یہ شعر بھی ؎

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور تک پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

("بانگِ درا" : "سرگزشت آدم")

اور پھر "درخت طور" اور "بانگ لاتخف" کی تلمیح بھی اقبال کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیے ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

("بالِ جبریل" : غزل ۳۲)

تو شاید اُن کے ذہن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گزرنے والا مندرجہ بالا واقعہ بھی رہا ہو جہاں بجائے اس کے کہ بندہ خدا کو پکارے، خدا خود بندے کو پکار کر (صرف اس لئے کہ اُس نے اپنی خودی کی ترتیب و تزئین کر کے اُسے مرتبۂ کمال کو پہنچا دیا ہے) اُسے ہمکلامی کا شرف تک بخشتا ہے۔ اس واقعہ کی مزید صراحت سورۃ "طٰہٰ ۲۰" کے رکوع ۱ میں بھی درج ہے جہاں اس آگ کی تلاش کے بہانے صرف ہمکلامی ہی نہیں بلکہ پیغمبری عطا کئے جانے کی بات کہی گئی ہے اور یہی ہے "سرِ کلیمی" جس نکتہ کو اقبال بار بار مختلف طریقوں سے ذہن نشیں کراتے ہیں - فرمایا گیا ہے :-

"وہاں (جہاں آگ نظر آئی تھی) پہنچا تو پکارا گیا : "اے موسیٰ" ! میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں اُتار دے، تو وادی مقدس طُویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے"۔

اور پھر جب خدا نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس شب و روز کے لئے کوہِ سینا پر طلب کیا تو آپؑ کے حاضر ہونے پر فرمایا :-

"اے موسیٰ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ (بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِکَلَامِیْ)۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اُسے

لے اور شکر بجالا" ـــــ (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۴۴)

یہ تھا مختصر سا قصہ "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے" پر۔ اِس نکتہ کو اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم "تضمین بر شعر ابو طالب کلیم" میں اس طرح بھی ذہن نشین کرایا ہے ؎

غافل اپنے آشیاں کو آکے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طورِ معنی پر کلیمِ نکتہ بیں

اور اِنہی تصورات کے تحت "بانگِ درا" ہی کی نظم "جوابِ شکوہ" کے بارہویں بند میں مسلمانوں کی غفلت پر اِس طرح طنز کیا ہے کہ ؎

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں

اور اپنی افسردگی کا اظہار بھی ایک نظم میں اِن الفاظ میں کیا ہے جو ایک درد بھرے دل کی آواز کہی جا سکتی ہے ؎

ہر دل مئے خیال کی مستی میں چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

("بانگِ درا" دردِ عشق")

یہ شعر ۱۹۰۵ء کے قبل کا ہے مگر اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اِسی تاسف کا اظہار اقبالؔ نے درجِ ذیل شعر میں حکیمانہ طور پر کیا۔ گرچہ یہ شعر اِسی مضمون میں قبل گزر چکا ہے مگر یہی وہ نکتہ ہے جو اتنی لمبی بحث سے وہ نکالنا چاہتے تھے اور یہ درجِ ذیل شعر آج بھی ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے شاید اِس کا دوبارہ ذکر قارئین پر گراں نہ گزرے گا کیونکہ یہی حاصلِ مطالعہ ہے۔ ورنہ شعراء بہت ہیں، اشعار بہت ہیں اور شاعری اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مگر: "شاعری جزویست از پیغمبری" صرف اقبالؔ کے حصّے میں آئی ؎

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی

("بالِ جبریل": غزل ۵۰)

کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اس مضمون کا عنوان "ضربِ کلیم" کی درج ذیل نظم : "طالبِ علم" سے ماخوذ ہے جو صرف اِنہی دو اشعار پر مشتمل ہے اور اِسی نظم کا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا جانا مقصود ہے :-

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اِضطراب نہیں !
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں !

اقبالؔ کے کلام میں جہاں بہت سی قرآنی اصطلاحات ہیں وہاں کچھ اصطلاحات اُنہوں نے لفظ "صاحب" میں کسرۂ اِضافت لگا کر بھی وضع کی ہیں جن میں اُنہوں نے قرآن اور حدیث کی لاتعداد ارشادات، احکامات اور تعلیمات کو سمو دیا ہے۔ ایسے تو "صاحب" کے لغوی معنی مالک لیا جاتا ہے اور "صاحبِ کتاب" سے وہ شخص مُراد لیا جائے گا جس پر اُس کتاب کا نزول ہوا ہو یا جو اُس کتاب کا مصنف ہو۔ مگر اقبالؔ نے اِسی اضافت سے ہر جگہ اسے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے ہر ایسی اصطلاح میں لفظ "صاحب" سے "پیرو" ہی مُراد لیا ہے۔ جیسے :-

آگ اُسکی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقین

("ضربِ کلیم" : "محرابِ گلُ افغان کے افکار"۔ سترھواں بند)

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام وَرے؟
("ضربِ کلیم": "سرود")

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خُلقِ عظیم"، صاحبِ "صدق و یقین"
("بالِ جبریل"۔ "مسجدِ قرطبہ")

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!
("بالِ جبریل": غزل ۱۰)

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہبان ہو صاحبِ مازاغ!
("ضربِ کلیم"۔ غزل (بعد از نظم "اساتذہ")

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!
("بالِ جبریل": رُباعی کا دوسرا شعر)

اِس نظم میں اقبالؔ کالج اور اسکول کے طلباء سے نہیں مخاطب ہیں بلکہ ہر اُس شخص سے مخاطب ہیں جو علم کا طالب ہو جس میں اوّل الذکر بھی آجاتے ہیں۔ صرف اشعار کی اِس نظم میں اقبالؔ نے قرآن کی روشنی میں علم کی مقصدیت اور افادیت پر ایک لمبی بحث چھیڑ دی ہے۔ مگر چونکہ وہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں وہ "علم" کی قرآنی حقیقت ہے جس کی رو سے اصل چیز حقیقت کا علم اور اُس کے مطابق عمل ہے اور اُسی پر انسان کی فلاح کا انحصار ہے۔ یہ علم صفاتِ الٰہی کا علم ہے۔ فرمایا گیا:-

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے"

— (سورۃ فاطر ۳۵۔ رکوع ۴)

یعنی جو شخص اللہ کی صفات سے جتنا زیادہ ناواقف ہوگا وہ اُس سے اتنا ہی بے خوف ہوگا اور برعکس اس کے جس شخص کو اللہ کی قدرت، اُس کے علم، اس کی حکمت، اُس کی قہاری و جباری، اور اس کی دوسری صفات کی اُسے جتنی معرفت حاصل ہوگی اتنا ہی وہ اُس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اُس کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔

متذکرہ بالا آیت میں "علم رکھنے والے لوگ" کے لئے قرآن میں "الْعُلَمٰٓؤُا" وارد ہوا ہے مگر اس آیت میں لفظ "علماء" سے وہ اصطلاحی عُلماء بھی مُراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اِس آیت کے مصداق صرف اُسی صورت میں ہوں گے جب کہ اُن میں خشیت اور خدا ترسی موجود ہو۔ یہی بات حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمائی ہے کہ:۔

"علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے"۔

اور یہی بات حضرت حسن بصریؒ نے فرمائی ہے کہ:۔

"عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے، جو کچھ اللہ کو پسند ہے اُس کی طرف وہ راغب ہو، اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اُس سے وہ کوئی دلچسپی رکھے"۔

"حقیقت کا علم" رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں کا تقابلی جائزہ خود خدائے تعالیٰ نے اِس طرح ارشاد فرمایا ہے:۔

"(اے نبیؐ) اُس (جو خدا سے بے خوف ہے) سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کُفر سے لطف اُٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔ (کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا ہے اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے اُمید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟

(قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ)

نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"

—— (سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۱)

ان آیات میں پہلے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے دُنیا کا سارا علم تو حاصل کر لیا مگر

پھر بھی گمراہی اور کفر میں مبتلا رہے۔ ایسے گروہ کو خدا نے بے علم (لَا یَعْلَمُوْن) قرار دیا ہے اور اقبالؔ نے اِس نظم کے آخری مصرعہ میں "کتاب خواں" کا نام دیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اُس کی بندگی و پرستش کو مستقل اپنا طریقۂ زندگی بنا لیا ہے۔ خدا نے اِن آیات میں ایسے لوگوں کو عالِم اور جاننے والے (یَعْلَمُوْنَ) قرار دیا ہے اور اقبالؔ نے ایسے ہی لوگوں کو "صاحبِ کتاب" کا نام دیا ہے۔ اقبالؔ نے اِس آخری مصرعہ میں اِن آیات کا یہی نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ یہ دونوں گروہ آخر یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں یہ مل کر ایک ہی طریقے پر چلیں اور آخرت میں دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوں؟

اِس نظم کے پہلے شعر میں اقبالؔ نے ترغیبِ عمل کے رُجحانات اُجاگر کرنا چاہا ہے، مگر دوسرے شعر میں اُسے "صاحبِ کتاب" سے وابستہ کر کے یہ نکتہ نکالا ہے کہ عملِ عشق سے فروزاں ہوتا ہے جس کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے۔ جس کے پیرو ہونے ہی پر کسی کے لئے "صاحبِ کتاب" کے زُمرہ میں شامل ہونا ممکن ہے۔ اقبال کے اِس عشق میں رچی اور بسی وہ مشعل ہے جو راہِ حیات میں ہر سنگِ گراں کو ذرّۂ بے مقدار بنا کر ختم کر دیتی ہے۔

اقبالؔ اُن علوم کے مخالف نہیں تھے جو دُنیوی یا درسی کتابوں سے حاصل کئے جاتے ہیں کیونکہ تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دینے کے لئے اُن سے بھی مستفیض ہونا لازمی اور ازبس ضروری ہے۔ وہ خود بھی اپنے زمانے کی یورپ جا کر اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر چکے تھے مگر ایسی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے شرط بھی لگا دی تھی۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کی نظم؛ "محرابِ گُل افغان کے افکار" کے انیسویں بند میں کہتے ہیں:۔

کھُلے ہیں سب کیلئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!
اِسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لَآ اِلٰہ نہیں!

اِسی سوز کی تلقین اقبالؔ نے اپنے صاحبزادے جاویدؔ اقبال کو کی تھی جب وہ انگلینڈ میں

زیر تعلیم تھے :۔

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ہے اِس کی نہاد کافرانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک باقی ہے کہاں مئے شبانہ!
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اُس کا مذاق عارفانہ
جو سر میں ہو لاالہٰ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ!

شاخِ گُل پر چہک و لیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

چونکہ یہی تعلیم اُنہوں نے اپنے بدن میں "سوزِ لَآ اِلٰہ" رکھ کر خود حاصل کی تھی اس لئے اپنے متعلق کہتے ہیں ؎

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

("بالِ جبریل" ۔ غزل ۱۶)

اِسے اتفاق کہا جائے یا سعادتِ ازلی کی یاوری و مُساعدت کہ اقبالؔ نے جتنا زیادہ مغربی افکار و خیالات کا مطالعہ کیا اتنا ہی اُنہیں مغربی علوم سے پیدا شدہ تہذیب، تمدّن اور ثقافت کے خلاف اُن میں ایک ناقدانہ ردِ عمل ترقی پذیر ہوتا چلا گیا۔ اُنہوں نے اِس ردِعمل کے طور پر ایک زندہ اور آئیڈیل سوسائٹی کی تعمیر کے لئے صرف اسلام اور اس کی تعلیمات کو بطور بنیادِ عمل میں پیشِ نظر رکھا کیونکہ قرآن ایک دستورِ حیات ہے اور اسلام فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

علوم، خواہ مشرقی ہو یا مغربی، اقبال ہر مکتبِ فکر کے طالبِ علم کے بدن میں لَآ اِلٰہ ہی کا سوز دیکھنے کے متمنی تھے چنانچہ مشرقی علوم کی درسگاہوں اور اُن سے فارغ التحصیل طالبعلموں سے بھی اُن کی مایوسی کا بھی عالم تھا۔ کہتے ہیں :۔

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اسرار بھی ہے؟
یہ پیرانِ کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!
صلہ اِن کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!

اُٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک!
نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت، نہ نگاہ!

"ضربِ کلیم" کی نظم: "تربیت" میں اپنے اِنہی تصورات کو اس طرح پیش کرتے ہیں:-

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سُراغ!
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اقبالؔ کا یہ کہنا کہ "کتاب خواں" ہونے کے باوجود اگر طالبِ علم "صاحبِ کتاب" نہ بن سکا تو اس کی وجہ اُن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ وہ علم کے ڈانڈے عشق سے اُستوار نہ کر سکا جو سب سے بڑی قوتِ محرکہ ہے اور اِسی وجہ سے اُس طالبِ علم کی موجوں میں اضطراب نہیں۔ "ضربِ کلیم" کی غزل (بعد از نظم "ہندی اسلام") میں تاسف کرتے ہیں کہ ؎

ترا بحر پُرسکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ!

اقبالؔ کے نزدیک جذبۂ عمل صرف جذبۂ عشق سے تقویت پاتا ہے جو تخلیقی فعلیت کا محرک ہے۔ اجزائے عالم کی تخلیق سراسر عشق سے ہوتی ہے اور وجہ آفرینش اور مقصدِ حیات انسانی عشق کے سوا کچھ نہیں۔ عشق بوالہوسی کا نام نہیں اور نہ جیسا غالبؔ نے کہا: "خلل ہے دماغ کا"۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو روحانی مسرت اور کسی بلند مقصد کے حصول کے لئے اپنے کو وقف کر دینے کا نام ہے۔ جو علم عشق سے محکم نہیں، ویسے علم کو اقبالؔ درج ذیل نظم میں "تخمین و ظن" اور ویسے طالبِ علم کو "بندہ تخمین وظن" اور "کرمِ کتابی" سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نظم میں علم سے مُراد دُنیوی علوم ہیں:- اور عشق سے مُراد وہ علم ہے جو ایک طالبِ علم کو حکما کی کتابوں سے بے نیاز کر کے اُسے قرآن حکیم کی روح سے آشنا کر دیتا ہے۔ عقل کتابوں کا نتیجہ ہوتی ہے یا کتابوں سے پیدا ہوتی ہے اور عشق خود "اُمّ الکتاب" یعنی کتابوں کی ماں ہے اور کتابی علوم اُسی عشق کا نتیجہ ہیں:-

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!
بندۂ تخمین و ظن! کِرمِ کتابی نہ بن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات!
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب!

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں!
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں!
عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب!

("ضربِ کلیم": "علم و عشق")

اقبالؔ کے نزدیک علم، جلالِ کائنات سے مرعوب رہتا ہے جس کے اصول جبری ہیں اور اس میں وجدانی، الہامی اور ارتقائی انکشافات اور اطلاعات کی گنجائش نہیں، جب کہ عشق کی رسائی، حدِ ادراک سے بھی پرے ہے: کہتے ہیں:۔

علم ترساں از جلالِ کائنات — عشق غرق اندر جمالِ کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر
علم پیما بستہ با آئینِ جبر — چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر

عشق آزاد و غیور و ناصبور
در تماشائے وجود آمد صبور

اقبالؔ نے، قرآن اور حدیث کی روشنیوں میں علم کا جو نظریہ قائم کیا اُس پر مزید روشنی "ضربِ کلیم" ہی کی نظم: "علم اور دین" میں ملتی ہے جو درج ذیل ہے:-

وہ علم اپنے بُتوں کا ہے آپ ابراہیم　　کیا ہے جس کو خُدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک　　دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی　　نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہم کنا نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

علم پر اقبالؔ کے یہ سارے نظریات سے یہ کلیّہ سامنے آتا ہے کہ علم وہ ہے جسے خدا نے دل و نظر کا ندیم بنایا ہو اور جو نتیجتاً بدن میں سوز لَآ اِلٰہَ پیدا کر دے۔ دوسرے الفاظ میں علم وہ ہے جس سے خود شناسی اور خدا شناسی کی توفیق حاصل ہو اور جس سے انسان کی خودی عشق سے مملو ہو کر اس میں شانِ فقر پیدا کر دے۔ "شانِ فقر" اقبالؔ کے یہاں ایک ایسی اصطلاح ہے جو "صاحبِ کتاب" کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے چونکہ اُس کی خودی عشق میں ڈوب کر مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اقبالؔ کے فکری نظام میں فقر کی بُنیادی اہمیت ہے اور اسی لئے "ضربِ کلیم" کے دَور میں اُنہوں نے اس پر بہت سی نظمیں اور لاتعداد اشعار رقم کئے۔ یہ تزکیۂ نفس یعنی تنزیہی کیفیت کے حصول کی متبادل اصطلاح ہے جو نفس و آفاق پر غلبہ اور تفوّق حاصل کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ ایک صاحبِ فقر اپنی زندگی کا شعار "شعائر اللہ" پر قائم کرتا ہے اور اپنی زندگی کی تصاویر میں "صِبْغَةَ اللّٰهِ" یعنی اللہ کا رنگ بھرتا ہے۔ "شعائر اللہ" کے متعلق خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خُدا پرستی کی نشانیوں کی بے حُرمتی نہ کرو،
یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ"
— (سورۃ المائدۃ ۵ - رکوع ۱)

دوسرے موقع پر فرمایا گیا :-

" بتوں کی گندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔ یہ ہے اصل معاملہ (اِسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے" ـــــ (سورۃ الحج ۲۲ - رکوع ۴)

اقبالؔ جب طالب علم سے کہتے ہیں کہ باوجود "کرم کتابی" بننے کے تو " صاحبِ کتاب" نہ بن سکا، تو وہ یہی کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام نہیں کرتا جو دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ اور اِسی لئے تیرے بدن میں " سوزِ لَآ اِلٰہ " نہیں اور نہ تیرے فکر و عمل کے موجوں میں کوئی اضطراب ہے۔ "صاحبِ کتاب" صرف یہی نہیں کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرتا ہے بلکہ وہ اپنی زندگی کی تصویر میں اللہ کا رنگ بھرتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کے صفات اپنا لیتا ہے کیونکہ خدا خود فرماتا ہے :-

" (اے نبیؐ) کہو : اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَةَ اللّٰہِ)۔ اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"

ـــــ (سورۃ البقرہ ۲ - آیت ۱۳۸)

جب " صاحبِ کتاب" اپنے مجسمہ کے خد و خال میں اللہ کا رنگ بھر لیتا ہے، تو وہ خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ شاہد و مشہود کا فرق اور امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اللہ کا رنگ زیادہ گہرا ہے یا " صاحبِ کتاب" کا۔ بقول اقبالؔ ؎

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

(" بانگِ درا" غزلیات حصہ اوّل)

خودی کی ترتیب و تزئین کے بعد جب ایک مومن اپنے عشق پر فقر کی سان چڑھا کر " شعائر اللہ" کا احترام کرتا اور خود میں اللہ کا رنگ بھر لیتا ہے تو اُس پر اسرارِ جہانگیری کھلتے

ہیں اور اُس کی مٹی میں خاصیت اکسیری پیدا ہوتی ہے اور بقول اقبالؔ یہی میراثِ مسلمانی اور سرمایہ شبیری ہے جس کے سامنے فغفوری تک جھکنے لگتی ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک ہر علم کا اپنی جگہ پر مقام ہے مگر وہ فقر پر اولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ مگر ایک باشعور انسان اِن دونوں کے حسین امتزاج سے حدِ ادراک کی اُس منزل کو طے کر لیتا ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔ اقبالؔ کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر طالبِ علم عشق اور علم کی صحیح طریقے پر ترتیب و تزئین کر کے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے کیونکہ یہی "مقصودِ فطرت" ہے۔ اور یہی "رمزِ مسلمانی" اِن دونوں کے دائرۂ کار پر اقبالؔ نے اپنے مخصوص انداز میں "بالِ جبریل" کی غزل ۵۹ میں اس طرح روشنی ڈالی ہے :-

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عِفّتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!
علم کا "موجود" اور، فقر کا "موجود" اور
اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!
دل اگر اِس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ!

الغرض اقبالؔ کے نقطۂ نظر سے جب انسان کی خودی عشق سے صیقل ہو کر فقر کے لبادہ میں جلوہ گر ہوتی ہے، یعنی جب وہ سچے دل سے اتباعِ شریعت کرنے لگتا ہے تو وہ "صاحبِ کتاب" ہو جاتی ہے جو ایک خالص قرآنی تصوّر ہے۔ ایسا انسان داعئ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاقِ حسنہ کا مقلّد اور گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہو جاتا ہے۔ اُس کے مزاج میں قہاری و غفاری و قدّوسی و جبروت کے چاروں عناصر ایک حسین تناسب سے جاگزیں ہوتے ہیں۔ اس مجسمہ کی تصویر تو سارا قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس ہے مگر چونکہ نظم: "طالب علم" اور اِس مضمون کے عنوان کا چونکہ تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا جا رہا ہے اِس لئے دونوں کی مناسبت سے ذیل میں چند ایسی آیات کے ترجمے درج کئے جا رہے ہیں جو "صاحبِ کتاب" کے مجسمہ کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں :-

"ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبّر نہیں کرتے۔ اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُنہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اُن کے اعمال کی جزاء میں اُن کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اُس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے۔"

— (سورۃ السجدۃ ۳۲۔ رکوع ۲)

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اِس کتاب کو جو اُس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اِس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں ؛ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور اُن کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ اُن کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے اُنہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے

رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر اُنہی لوگوں کے لئے ہے۔ یعنی ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی اُن میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے جو صالح ہیں وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے اُن کے استقبال کے لئے آئیں گے اور اُن سے کہیں گے: "تم پر سلامتی ہے۔ تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اُس کی بدولت آج تم اِس کے مستحق ہوئے ہو"۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر! رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور اُن کے لئے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانا ہے"۔۔۔۔ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۳)

"حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے اگر کوئی بُرا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر اُنہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریقِ کار کیا ہے"

۔۔۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲۴)

"سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ اُن کے لئے اُن کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے"۔۔۔۔

(سورۃ الانفال ۸۔ رکوع ۱)

"یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے۔ اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔۔۔ (سورۃ الدھر ۷۶۔ رکوع ۲)

"لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اُس کی پناہ ڈھونڈیں گے اُن کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ اُن کو دکھا دے گا"۔

(سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۴)

یہ تھا مختصر سا اجمالی خاکہ "صاحبِ کتاب" کا۔ قرآن نے صرف اِن کا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ لاتعداد مواقع پر اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے انہیں "صاحبِ کتاب" ہونے کے صلہ میں خوشخبریاں بھی دی ہیں۔ نفسِ مضمون کی خاطر صرف ایک ایسی آیت درج ذیل ہے:

"اور اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)، جو لوگ اِس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اِس کے مطابق) اپنے عمل دُرست کرلیں، انہیں خوشخبری دے دو کہ اُن کے لئے ایسے ایسے باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے۔ جب کوئی انھیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اِس سے پہلے دُنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے۔ اُن کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵)

"کتاب خواں" کی نفسیات کو قرآن میں اِس طرح بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے:۔

"آخر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ اس نصیحت (قرآن) سے مُنہ موڑ رہے ہیں، گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔ بلکہ اِن میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کُھلے خط بھیجے جائیں۔ ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اُس سے سبق حاصل کرلے۔ اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہ اِس کا حقدار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے اور

وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے۔"

— (سورۃ المدثر ۷۴۔ رکوع ۲)

ایک موقع پر "کتاب خواں" اور "صاحبِ کتاب" دونوں کی نفسیات کا تقابلی جائزہ اور اُن کا انجام اِس طرح بھی وارد ہوا ہے :-

"جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرے گا اور اُس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت ہے جو آگ میں جائے گا۔ پھر نہ اُس میں مرے گا نہ جئے گا" —

(سورۃ الاعلیٰ ۸۷۔ رکوع ۱)

" یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا)

اور نامراد ہوا وہ جس نے اُسے دبا دیا (وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا)" —

اقبالؔ جب "طالبِ علم" سے یہ کہتے ہیں کہ تو علم کی طلب میں کتابیں تو بہت پڑھتا ہے مگر چونکہ تو نے "کتاب" (قرآن) کا علم حاصل نہیں کیا اسی لئے سے

کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

جب ایسے "کتاب خواں" کو اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ تو "صاحبِ کتاب نہیں" تو وہ درجِ ذیل آیات کی یاد دلاتے ہیں :-

" ہم اُن کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے مُنہ موڑ رہے ہیں" — (سورۃ المومنون ۲۳۔ رکوع ۴)

" لوگو، ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو" — (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰)

" حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مُرید بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آچکی ہے" — (سورۃ النجم ۵۳۔ رکوع ۱)

" جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے، ہم اُس پر ایک شیطان مُسلط کر دیتے ہیں اور وہ اُن کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے

سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں"
— (سورۃ الزُّخرُف ۴۳۔ رکوع ۴)

" پس اے نبیؐ، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دُنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ اِن لوگوں کا مَبلغِ علم بس یہی کچھ ہے" — (سورۃ النجم ۵۳۔ رکوع ۲)

" اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (دنیا حاصل کرنے کی دُھن کی روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہیں ہوتا۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سُن لو) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لوگے۔ پھر ضرور اُس روز (روزِ حشر) تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی" — (سورۃ التکاثُر ۱۰۲۔ رکوع ۱)

" یہ (قرآن) ربُّ العالمین کا نازل کردہ ہے، پھر کیا اِس کلام کے ساتھ بے اعتنائی برتتے ہو، اور اِس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اِسے جھُٹلاتے ہو؟" — (سورۃ الواقعہ ۵۶۔ رکوع ۲)

اقبالؔ جب" طالبِ علم" کو اِس نظم کے پہلے شعر میں یہ کہتے ہیں کہ :" تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں" تو اِس کا مداوا بھی وہ قرآن ہی میں غوطہ زنی بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تُجھ کو عطا جدّتِ کردار

(" ضربِ کلیم": " اشتراکیت")

الغرض اقبالؔ، اِس مختصر سی نظم میں" طالبِ علم" کو اپنے دماغ، عقل اور علم کے ساتھ دِل کو عشق سے روشن کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ جب تک علم کے ساتھ عشق بھی کارفرما نہ ہو مقصودِ حیات پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ہے" اسرارِ کتاب" جس کے متعلق وہ کہتے ہیں ؎

تھا ضبط بہت مُشکل اِس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

(" بالِ جبریل": غزل ۲۹)

نظم

"اَلاَرضُ لِلّٰہ"

(قرآن کی روشنی میں)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خُدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں!

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، تیری نہیں!

("بالِ جبریل": نظم "الارض للّٰہ")

اقبالؔ اس نظم میں اُس جاگیردارانہ زرعی نظام کی مذمت کرتے ہیں جہاں کوئی جاگیردار یا زمیندار کسی زمین کو اپنی ملکیت سمجھ کر اُس کی پیداوار کو صرف اپنے تصرف میں لانا اپنا حق سمجھتا ہو جب کہ اُس کے پیدا کرنے میں کسی اور نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ برصغیرِ ہند میں، آزادی کے قبل زرعی

زمینوں کا یہی نظام رائج تھا۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ پنجاب میں ہمیشہ سے زمیندار سے مراد کاشتکار لیا جاتا رہا ہے جب کہ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں زمیندار سے مراد وہ شخص تھا جو سرکار کی طرف سے "بندوبست دوامی" کے تحت لگان وصول کر کے مقررہ رقم سرکار کے خزانہ میں ہر سال جمع کیا کرتا تھا۔ بہرحال ملک میں اس زرعی نظام کے الگ الگ نام تھے اور پنجاب میں اُسے جاگیرداری سے موسوم کیا جاتا تھا۔

اقبال نے اپنی اوائل عمر میں معاشیات پر ایک کتاب تصنیف کی تھی مگر وقت کے گزرنے اور بین الاقوامی سیاست کے عمل اور ردِ عمل کے طور پر اُن کے تصوّرات میں خاصی تبدیلی رونما ہوتی گئی جو "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے ادوار میں آکر شعلہ فشاں بن کر پھوٹ پڑی۔ "بالِ جبریل" کے دور میں اقبال کے تصوّرات میں یہ تبدیلی ۱۹۱۷ء کے روسی اشتراکی انقلاب کی وجہ سے ہوئی جس کی اَنمٹ چھاپ اُن کی کئی نظموں میں ہے جیسے "لینن (خدا کے حضور میں)"، "فرمانِ خدا (فرشتوں سے)" وغیرہ۔ موخر الذکر نظم میں تو اقبال یہاں تک کہہ بیٹھے کہ ؎

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟ — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو شاید اُنہیں "نکسلیوں" میں شمار کیا جاتا مگر اُنہوں نے یہ آواز اس وقت اُٹھائی تھی جب ہندوستان میں برطانوی سامراجیوں کی گرفت تھی اور سلطنتِ برطانیہ میں آفتاب نہیں غروب ہوا کرتا تھا۔

اقبال اشتراکی نہ تھے کیونکہ، جیسا میں نے کہا ہے، ایک مسلمان گمرہی و کفر میں مبتلا تو ہو سکتا ہے مگر وہ کبھی اشتراکی نہیں ہو سکتا کیونکہ اشتراکیت کی بنیاد ہی لادینیت پر ہے۔ اور چونکہ اس فلسفہ کے بانی کارل مارکس نے مذہب کو "افیون" قرار دیا ہے۔ اقبال نے اس روسی انقلاب کو اس لئے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا کیونکہ بقول اُن کے :-

تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل

("بالِ جبریل": "لینن (خدا کے حضور)")

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے،
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

("بالِ جبریل": "زمانہ")

جب روس میں اشتراکیت کی جڑیں کافی مضبوط ہو گئیں تو اقبال کو یہ خدشہ ہوا کہ چونکہ ساری دنیائے اسلام پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کے خاتمہ پر مغربی سامراجیوں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں اور مسلمانانِ عالم انتہائی غربت اور کس مپرسی میں مبتلا ہیں اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اشتراکیت کے شکار ہو جائیں۔ اس لئے "ضربِ کلیم" کی نظم "اشتراکیت" میں پہلے تین اشعار میں مغربی سامراجیوں کے تسلط کے ذریعہ معاشی نظام کی بیخ کنی پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار!
اندیشہ ہو شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار!
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار!

مگر بعد کے اشعار میں وہ مسلمانوں کو پھر اسلامی معاشی نظام کی طرف لوٹنے کی اس طرح تلقین کرتے ہیں:۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ "قُلِ العَفوَ" میں پوشیدہ ہے ابتک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اقبالؔ اُس معاشی نظام کے دلدادہ تھے جو اسلامی اصولوں کے مطابق مساوات اور عدل و انصاف

کی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہو۔ وہ کسانوں اور مزدوروں کے استحصال پر اس درجہ افسردہ تھے کہ خدا سے جھنجھلاہٹ میں یہاں تک پوچھ بیٹھے کہ۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؛
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؛
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

مگر خدا کے حضور اِس شوخی پر اپنی خلوص نیتی کا اظہار، قبل یہ سوال پوچھنے کے، اس طرح کیا کہ ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

("بالِ جبریل": لینن (خدا کے حضور میں"

زرعی اور معاشی معاملوں میں اقبالؔ کا نصب العین نظام" قُلِ الْعَفْوَ "میں پوشیدہ تھا۔ اقبالؔ باتیں شیکسپیئر کی کر رہے ہوں یا داغؔ کی، رام کا ذکر ہو یا نانک کا، غلام قادر روہیلہ ہو یا مسولینی، نیپولین کی باتیں ہو رہی ہوں یا کارل مارکس کی دینِ اسلام کا دامن اُن کے ہاتھوں سے نہ چھوٹتا تھا اور ایمان و یقین کا کوئی نہ کوئی نکتہ وہ اِن ساری نظموں میں درپردہ ضرور ذہن نشیں کراتے چلتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دہقاں کی باتیں کرتے ہیں تو اگر وہ ملک کے دہقاں کو بیداری، ترقی اور سربلندی کا پیغام دیتے ہیں تو ساتھ ساتھ وہ اُسے روحانی تربیت، خودی کی تکمیل اور توحیدِ الٰہی کے عقیدہ کا اثبات کرنے کی بھی اصلاح دیتے ہیں۔ چنانچہ روسی انقلاب کے چند سالوں بعد ہی" بالِ جبریل" کی نظم" پنجاب کے دہقاں سے" میں کہتے ہیں۔

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز — ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
اِسی خاک میں دب گئی تیری آگ — سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات — نہیں اِس اندھیرے میں آبِ حیات!
زمانے میں جھوٹا ہے اُس کا نگیں — جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں!
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ — رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ!

یہی دینِ محکم ، یہی فتحِ باب ، کہ دُنیا میں توحید ہو بے حجاب!

اتنا کہہ چکنے پر آخری نصیحت ، درجِ ذیل شعر میں وہ مسلمانوں کو یہ کرتے ہیں کہ تو جس طرح زمین کی خاک میں دانہ بوتا ہے اُسی طرح تمہیں بدن کی مٹّی میں دل کا دانہ بونا چاہیئے کیونکہ یہ وہ دانہ ہے جس کی بدولت تمہیں خیرِ کثیر حاصل ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں

نظم "الارض للہ" میں اقبالؔ "دہ خُدایا" سے مخاطب ہیں مگر اس سے اُن کی مراد وہ سارے اہل کار ہیں جو زمین کے کسی خطّہ پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ "دہ" فارسی میں "گاؤں" کے معنی میں مستعمل ہے اور "دیہ" کے بھی یہی معنی ہیں مگر "دہ" کلمۂ نفریں بھی ہے۔ وہ اُسے یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ جسے تم اپنی مِلک سمجھ رہے ہو وہ نہ تمہاری ہے اور نہ تمہارے آبا کی ہے بلکہ مِلک تو خُدا کی ہے جس پر اُس کے مرتب کئے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے نہ کہ تمہارا۔

اقبالؔ نے اِس نکتہ کی مزید وضاحت اپنے فارسی کلام "جاوید نامہ" کے اِن اشعار میں اس طرح کی ہے۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مُفت است مُفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

اقبالؔ کا کہنا یہ ہے کہ "متاعِ بے بہا" یعنی زمین تو خُدا نے انسانوں کو مُفت ودیعت کی ہے کیونکہ یہ خدا کی مِلک ہے نہ کہ "دِہ خُدایا" کی۔ یہ ساری چیزیں انسان کی خدمت گزاری کے لئے پیدا کی گئی ہیں نہ کہ اُن کو مقصود بالذّات سمجھنے کے لئے۔ اِس لئے اگر مزدور یا کاشتکار اُس زمین سے اپنا رزق پیدا کر رہا ہے تو تم بھی اپنا رزق شہر یا میدان یا چاند تاروں میں جا کر تلاش کرو کیونکہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ نہ کہ اُس کے رزق کو اپنا رزق سمجھ کر اُس پر زیادتی کرو بلکہ "ہر گھڑی پیشِ نظر لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَاد رکھ" کیونکہ تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر پلٹنا خدا ہی کی طرف ہے۔ ارشادِ باری ہے :-

" وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خُدا کا رزق، اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے، تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اِس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ میری تنبیہہ کیسی ہوتی ہے " ___ (سورۃ المُلک ۶۷ - رکوع ۲)

زمین کی چھاتی پر چل کر اپنا رزق حاصل کرتے وقت خُدا نے یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ حد سے تجاوز نہ کرو - فرمایا :-

" اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لئے کیا ہے کہ ہر متنفّس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ ہوگا " ___ (سورۃ الجاثیہ ۴۵ - آیت ۲۲)

" زمین کو اُس خدا نے سب مخلوقات کے لئے بنایا " ___ (سورۃ الرحمٰن ۵۵ - آیت ۱۰)

اِنہی باتوں کے پیشِ نظر خُدا نے یہ بھی فرمایا کہ :-

" اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حُکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو " ___ (سورۃ النحل ۱۶ - آیت ۹۰)

اقبالؔ نے اس نظم کا نام " الارض للہ " اُنہی معنوں میں رکھا ہے جن معنوں میں زمین کی نوعیت اور اس کی ماہیت کا ذکر قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اس نظم کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ زمین خُدا کی مِلک ہے اور یہ بطور " ٹرسٹ " انسانوں کے حوالے تصرُّف میں لانے کے لئے کی گئی ہے اور انسان کی حیثیت ایک " ٹرسٹی " یعنی متولّی یا امین سے زیادہ نہیں اور چونکہ مِلک اللہ کی ہے اس لئے اس پر نفاذ قانونِ الٰہی کا ہی ہوگا۔ آسمانوں اور زمین کی مِلکیّت کے متعلق خدائے تعالےٰ کا ارشاد ہے :-

" اِن سے پوچھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ ___ کہو : " سب کچھ اللہ ہی کا ہے " ___ (سورۃ الانعام ۶ - رکوع ۱)

" اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور اُن سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں

کے درمیان پائی جاتی ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اُس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے"
(سورۃ المائدۃ ۵ - رکوع ۳)

• زمین اور آسمان اور اُن کی ساری موجودات اُس کی ملک ہیں، اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے"۔ ــــ (سورۃ المائدۃ ۵ - رکوع ۳)

" زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے"۔ ــــ (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۳۴)

" رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے، سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ ــــ (سورۃ الانعام ۶ - آیت ۱۳)

" کہو: "خدایا، مُلک کے مالک (مٰلِكَ الْمُلْكِ)، تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔ ــــ (سورۃ آل عمران ۳ - آیت ۲۶)

• زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ ــــ (سورۃ آل عمران ۳ - آیت ۱۲۹)

" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی اُنہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں، اللہ ہی مالک ہے اُن سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے"۔ ــــ
(سورۃ النساء ۴ - رکوع ۱۹)

" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، وہ برتر اور عظیم ہے"۔ ــــ
(سورۃ الشوریٰ ۴۲ - آیت ۴)

" آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اُس چیز کا رب جو آسمانوں و زمین کے درمیان ہے اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو"۔ ــــ (سورۃ الدخان ۴۴ - آیت ۷)

" پس تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو زمین اور آسمان کا مالک اور سارے جہاں والوں

کا پروردگار ہے"۔۔۔۔ (سورۃ الجاثیہ ۴۵ - آیت ۳۶)

" اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اُس کی مِلک ہیں، سب کے سب اُس کے مطیع فرمان ہیں"۔۔۔۔ (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۱۴)

" فرعون نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: " اور یہ ربّ العالمین کیا ہوتا ہے؟"

موسیٰؑ نے جواب دیا: " آسمانوں اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو"۔۔۔۔ (سورۃ الشعرآء ۲۶ - رکوع ۲)

" اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے"۔۔۔۔

(سورۃ التوبہ ۹ - رکوع ۱۴)

" اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بے شک وہی غنی و حمید ہے"۔۔۔۔ (سورۃ الحج ۲۲ - آیت ۶۴)

اقبال عنوان " الارض للہ " کے تحت زمین کو صرف خدا کی مِلکیت ہی نہیں بتاتے بلکہ درپردہ اس مِلکیت پر اُس کی فرمانروائی بھی ذہن نشین کراتے ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنی مِلک بتادے اور اگر اُس مِلک پر اُس کا حکم نافذ نہ ہوتا ہو تو دُنیوی قانون کے تحت بھی مِلکیت پر حق کی شکل بدل جاتی ہے۔ چہ جائیکہ یہاں باتیں خُدا کے مِلک کی ہیں جو خود اس کا موجد ہے۔ یہ کہ خُدا اِس " ارض " کا مالک ہی نہیں بلکہ فرمانروا بھی ہے اور اس پر حکم اُسی کا چلتا ہے اِس کی تصدیق بھی خود خدائے تعالیٰ نے اِس طرح کی ہے:۔

" اللہ حکومت کر رہا ہے (وَاللّٰهُ يَحْكُمُ)، کوئی اُس کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے والا نہیں ہے اور اُسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔۔۔۔ (سورۃ الرعد ۱۳ - رکوع ۶)

" آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔۔۔۔ (سورۃ النور ۲۴ - آیت ۴۲)

" وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اُس کی

ایک تقدیر مقرر کی۔" ___ (سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۲)

"فرمانروائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔" ___

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۹)

"زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" ___ (سورۃ المائدۃ ۵۔ آیت ۱۲۰)

"زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور جس روز قیامت کی گھڑی آکھڑی ہوگی اُس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔" ___ (سورۃ الجاثیہ ۴۵۔ آیت ۲۷)

خُدا نے اِس ارض و سما پر صرف اپنی مِلکیت اور فرمانروائی ہی کا بار بار اعلان نہیں فرمایا ہے بلکہ اُن کی وراثت کا حقدار بھی خود ہی کو بتایا ہے جو بات کہ کسی بھی ملکیت کو اپنی مِلک کہنے پر لازم و ملزم طور پر آتی ہے۔ فرمایا:۔

"آخر کار ہم ہی زمین اور اُس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری ہی طرف پلٹائے جائیں گے۔" ___ (سورۃ مریم ۱۹۔ آیت ۴۰)

"زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔" ___ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۸)

اقبالؔ نے اِس نظم "الارض للہ" میں "دِہ خُدایا" کو زمین کی مِلکیت، اس پر فرمانروائی اور اِس کی وراثت پر خُدائے تعالےٰ کی ان ہی سب فرمودات کو ذہن نشین کرایا ہے جن کا ذکر ابتک قرآنی آیات کے حوالے سے کیا گیا۔ اور اِنہی ساری آیات کے پس منظر میں اقبالؔ نے اُسے دو ٹوک کہا کہ: "حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت"۔ کیونکہ یہ زمین نہ تمہاری ہے اور نہ تمہارے آباء و اجداد کی۔ نہ تم اِس کے مالک ہو اور نہ اِس پر تمہاری فرمانروائی ہے اور نہ یہ تمہیں وراثت میں ملنے والی ہے۔ اِس لئے تمہیں لگان اُسی حد تک لینا ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہے نہ کہ استحصال اور زور و ظلم کی بنا پر۔ اگر تمہیں اپنا رزق حاصل کرنا ہی ہے تو: رزق و گور از وے بگیر، اور انگیر۔ اس لئے کہ فرمانِ باری ہے کہ:۔

"ہم نے زمین کو پھیلایا، اُس میں پہاڑ جمائے، اُس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک

نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی، اور اُس میں معیشت کے اسباب فراہم کئے، تمہارے لئے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لئے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔___ (سورۃ الحجر ۱۵ رکوع ۲)

ان ساری باتوں کو جو نظم "الارض للہ" کے آخری شعر پر اب تک کی گئیں اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے چوتھے بند کے مندرجہ ذیل شعر کے دوسرے مصرع میں اِس طرح نظم کیا ہے ؎

افغان باقی ! کہسار باقی !
اَلْحُکْمُ لِلّٰہ ! اَلْمُلْکُ لِلّٰہ !

اِس نظم کے آخری شعر پر اقبالؔ زمین کو خدا کی ملکیت، اُس پر اس کی فرمانروائی اور اُس کی وراثت ہی "دِہ خُدایا" کو ذہن نشین کرا کر نہیں رہ جاتی بلکہ اِس نظام عالم کی تدبیر کا بھی ذکر نظم کے پہلے تین اشعار میں مثالیں دے کر پیش کرتے ہیں کیونکہ خدا خود فرماتا ہے:۔

• ان (منکرین و کافرین) سے پوچھو: ...... کون اِس نظم عالم میں تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو: " پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟"___

(سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۴)

• "اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لئے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے"___ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۱)

" وہ آسمان سے زمین تک دُنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اِس تدبیر کی روداد اُوپر اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دِن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے"___ (سورۃ السجدہ ۳۲۔ آیت ۵)

زمین پر خدا کی ملکیت، فرمانروائی اور وراثت کے ثبوت میں اِسی نظم کے پہلے تین اشعار میں اقبالؔ نے جس استفہامیہ انداز و لہجہ میں "دِہ خُدایا" کو مخاطب کیا ہے اُسی انداز و لہجہ میں خُدا نے بھی قرآن میں منکرین اور کافرین کو مخاطب کر کے اِنہی دلائل کو پیش کیا ہے۔

اسی لئے اقبالؔ نے بھی اِن تینوں اشعار کے ہر مصرعہ میں وہی استفہامیہ انداز و لہجہ اختیار کیا جانا مناسب سمجھا۔ اب ذیل میں ہر شعر کے ہر مصرعہ کی ترجمانی اِن آیات سے ذہن نشین کیجئے:۔

پہلا شعر: پہلا مصرعہ "پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟":۔

"دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟" ـــ (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۱۲)

"کبھی تم نے سوچا یہ بیج جو تم بوتے ہو، اُن سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا اُن کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھُس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چٹی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں"ـــ
(سورۃ الواقعہ ۵۶۔ رکوع ۲)

دوسرا مصرعہ "کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟":۔

"کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہے، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟" ـــ (سورۃ الواقعہ ۵۶۔ رکوع ۲)

"وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اُس کی پاکی بیان کرتی ہیں اور فرشتے اُس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں" ـــ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۲)

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اُسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اُٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے" ـــ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۲)

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس

میں ایک بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔" ——— (سورۃ النحل ۱۶ رکوع ۲)

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ...... بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اِس کے ذریعہ سے غلّے اور سبزی اور گھنے باغ اُگائیں؟" ——— (سورۃ النبأ ۷۸۔ رکوع ۱)

"اور اگر تم (نبیؐ) اِن سے پوچھو: "کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا؟" تو یہ ضرور کہیں گے: "اللہ نے"۔ کہو: "الحمدُ للہ" مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں"۔ ——— (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۶)

دوسرا شعر، پہلا مصرعہ "کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟" :-

"وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر ہم اُسے ایک اُجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اُس کے ذریعہ سے اُسی کے زمین کو جِلا اٹھتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اُٹھنا بھی اِسی طرح ہو گا"۔ ———

(سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۹)

"اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوتے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مُردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اِس طرح ہم مُردوں کو حالتِ موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اُس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اِسی طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہونے والے ہیں"۔ ——— (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷)

"بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اِس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔ زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں"۔ ——— (سورۃ الحجر ۱۵۔ رکوع ۲)

"اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ اِن بادلوں

کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور اُنہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اُس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جِلا اُٹھاتا ہے۔ یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں" ــــ (سورۃ الروم ۳۰۔ رکوع ۵)

" اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اُس کو زمین میں ٹھیرا دیا، ہم اُسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔ پھر اِس پانی کے ذریعے سے ہم نے تمہارے لئے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے، تمہارے لئے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور اُن سے تم روزی حاصل کرتے ہو" ــــ

(سورۃ المومنون ۲۳۔ رکوع ۲)

دوسرا مصرعہ ۔ پہلا ٹکڑہ : خاک یہ کس کی ہے ؟ " :-

" اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اِس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں" ــــ (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۱)

" کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا ؟ (اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا)

(سورۃ النبأ ۷۸۔ آیت ۶)

دوسرا مصرعہ دوسرا ٹکڑہ : کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟" :-

" کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے . . . ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا ؟ (وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا)" ــــ (سورۃ النبأ ۷۸ ۔ رکوع ۱)

" تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے ؟ اگر وہ چاہتا ہے تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا ہے۔ ہم نے سورج کو اِس پر دلیل بنا دیا۔ پھر (جیسے جیسے سورج اُٹھتا جاتا ہے) ہم اُس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں" ــــ (سورۃ الفرقان ۲۵۔ رکوع ۵)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن کیا" ـــــ (سورۃ المؤمن ۴۰۔ رکوع ۷)

تیسرا شعر: "کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟

موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟" :۔

"وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے، جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتے" ـــــ (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۱۷)

"اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کے نباتات اگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھل کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑ جاتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آتے ہیں اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں" ـــــ

(سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۹۹)

"زمین کو اس نے سب مخلوقات کیلئے بنایا ہے اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ)" ـــــ (سورۃ الرحمٰن ۵۵ رکوع ۱)

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعہ وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کو اگانا تمہارے بس میں

نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (اِن کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں"۔ (سورۃ النمل ۲۷۔ آیت ۶۰)

اِس نظم "الارض للہ" کا ما حصل "دِہ خدایا کے لئے یہ ہے کہ:۔

"سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔ آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اِس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو (اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ)۔ انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو"۔ (سورۃ الرحمٰن ۵۵۔ رکوع ۱)

" وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے۔ اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو۔ جو لوگ اُس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اِس کے لئے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سُن لو، جو لوگ اُس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

اور آخر میں ایک بار پھر اُس مشورہ کو بھی سن لیجئے جو اقبالؔ جیسا عاشقِ رسولؐ ہی ایک دہقاں کو بھی دینا نہ بھولتا ہے کہ ؎

بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد زحاصل نشاں

قُلِ العَفوَ

(اقبالؔ کی نظم "صِدّیقؓ" قرآن اور حدیث کی روشنیوں میں)

چونکہ اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم "صدیقؓ" میں "قُلِ العَفوَ" کے نکتہ کو ہی ذہن نشیں کرایا ہے اس لئے قبل اس کے کہ اس نظم کا مطالعہ قرآن اور حدیث کی روشنیوں میں کیا جائے یہ ضروری ہے کہ پہلے اسی نکتہ کو قرآن اور حدیث کے حوالوں سے ذہن نشیں کرلیا جائے۔

دنیاوی جاہ وجلال، شان وشوکت اور مال ودولت سے بے رغبتی دینِ اسلام کی روح ہے جس بے رغبتی کے لئے اقبالؔ نے اپنے سارے کلام میں "فقر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہی جاہ وجلال، شان وشوکت اور مال ودولت کی علّتیں انسان میں تکبّر اور رعونت اور معاشرہ میں عدم مساوات کا موجب بنتی ہیں۔ اسی لئے قرآن اور احادیث میں مال خرچ کرنے کی ترغیب اور ساتھ ساتھ اس کے فضائل مختلف طریقوں سے مختلف مواقع پر ذہن نشیں کرائے گئے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے حضورِ اقدسؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:-

"ہر اُمّت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے۔ میری اُمّت کا فتنہ مال ہے۔"

(ترمذی، مشکوٰۃ بحوالہ: "فضائلِ صدقات" حصّہ اوّل)

راہِ خُدا میں خرچ کرنے کے لئے قرآن میں کچھ اصول وضوابط متعین کئے گئے ہیں۔ فرمایا خدائے تعالےٰ جلّ شانہٗ نے:-

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ (یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ)۔ جواب دو کہ:

"جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کروگے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ (سورۃ البقرہ ۲ آیت ۲۱۵)

" قُلِ الْعَفْوَ " کی صراحت مختلف روایات میں اس طرح آئی ہیں" :-

" حضرت بن عباس فرماتے ہیں کہ : " اپنے اہل و عیال سے جو بچے وہ عفو ہے "۔
حضرت ابو امامہؓ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ : " اے آدمی ! جو تجھ سے زائد ہے اُس کو تو خرچ کر دے ۔ بہتر ہے تیرے لئے ، اور تو اُس کو روک کر رکھے یہ تیرے لئے بُرا ہے ۔ اور بقدر ضرورت پر کوئی ملامت نہیں ۔ اور خرچ کرنے میں اُن لوگوں سے ابتدا کر جو تیرے عیال میں ہیں - اور اونچا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) بہتر ہے اُس ہاتھ سے جو نیچے ہو (یعنی لینے کیلئے پھیلا ہوا ہو) " حضرت عطاء سے بھی یوں نقل کیا گیا ہے کہ :
" عَفْوَ " سے مراد ضرورت سے زائد ہے "۔

(در منثور)

کتنا خرچ کیا جائے اس کا تناسب تو مندرجہ بالا آیت اور روایت سے واضح ہے۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ خیرات کیا ہی کیوں جائے ۔ یا صدقہ دیا ہی کیوں جائے ۔ اِن کا جواب بھی قرآن میں بصراحت موجود ہے فرمایا :-

" قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے ، اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو ، اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا ، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں ۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا (فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی) ، اور بھلائی کو سچ مانا (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی) ، اُس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی) - اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی (وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی) اور بھلائی کو جھٹلایا (وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی) اُس کو ہم سخت راستے کے لئے سہولت دیں گے (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی) - اور اُس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے ؟ بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے ، اور درحقیقت آخرت اور دنیا ، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں ۔ پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے ۔ اُس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا - اور اُس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار

جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے (وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی o مَالَهُ یَتَزَکّٰی)، اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لئے یہ کام کرتا ہے۔ اور ضرور وہ (اُس سے) خوش ہوگا (وَلَسَوْفَ یَرْضٰی)"۔

(سورۃ الّیل ۹۲ رکوع ۱)

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا (وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ)"۔

(سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۹۲)

"ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالاں کہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کرنے کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔ اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔ (سورۃ الحدید ۵۷۔ رکوع ۱)

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو (وَاَحْسِنُوْا) کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے (اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ)"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۹۵)

"یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی

بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رُسوا کُن عذاب مُہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسّر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے اُن کی نیکی کا حال چھپا نہ رہتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔"—— (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۶)

"یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے اُن کے عمل کی دُہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"—— (سورۃ سبا ۳۴۔ رکوع ۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اُس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں"——

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵۴)

"جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اُس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے"—— (سورۃ سبا ۳۴۔ رکوع ۵)

"جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳۶)

متذکرہ بالا آیات سے "کیوں خیرات کریں یا صدقہ دیں" کا جواب یہ ملتا ہے کہ خیرات کرنے یا صدقہ دینے یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مقصد اپنے رب کی رضا جوئی حاصل کرنی اور اپنے کو پاکیزہ بنانا ہے۔ اور نتیجتاً دوزخ بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلائے جانے سے اپنے کو بچانا ہے۔

جو مال کہ اللہ کی راہ میں، اللہ کی رضا جوئی اور پاکیزگی کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے اُسے خدا نے "قرضِ حسن" سے موسوم کیا ہے۔ ارشاد ہے :۔

"تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن (قَرْضًا حَسَنًا) دے تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اُس کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۴۵)

"قرضِ حسن" کا لفظی ترجمہ اچھا قرض ہے۔ یعنی ایسا قرض جو نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اِس لئے جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جاتا ہے اُسے خدا "قرضِ حسن" قرار دیتا ہے۔ اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اُس سے کئی گنا بڑھا چڑھا کر زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ رکھی گئی ہے کہ وہ قرض اپنی کسی نفسانی غرض کے لئے نہ دیا جائے بلکہ صرف اللہ کی رضا جوئی حاصل کرنے کی خاطر، اُن کاموں میں خرچ کیا جائے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ "قرضِ حسن" کے متعلق قرآن کی دوسری سورتوں میں ارشاد ہے :۔

"کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور

اس کے لئے بہترین اجر ہے (مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ) ــــ (سورۃ الحدید ۵۷۔ آیت ۱۱)

• پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے" ــــ (سورۃ المزمل ۷۳۔ رکوع ۲)

• قرضِ حسن پر "منثور" میں ایک حدیث اس طرح درج ہے کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ :۔

"اے آدمی! اپنا خزانہ میرے پاس امانت رکھ دے۔ نہ اِس میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے نہ غرق ہونے کا، نہ چوری کا۔ میں ایسے وقت میں وہ تجھ کو پورا پورا واپس کر دوں گا، جس وقت تجھے اِس کی انتہائی ضرورت ہوگی"

(بحوالہ : "فضائلِ صدقات" حصہ اوّل)

کتنا اور کیوں کے بعد سوال آتا ہے کہ خیرات میں کیسی چیزیں دی جائیں۔ اس پر بھی قرآن میں بہت صریح احکامات وارد ہوئے ہیں :۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے، اُس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کیلئے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز لینا گوارا نہ کرو گے الاّ یہ کہ اُس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمہیں جان لینا چاہیئے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔ شیطان تمہیں مُفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت ملی، اُسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف

وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔ تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اس کا علم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر آپ صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال اُس کی خبر ہے......

(سورۃ البقر ۲ ۔ رکوع ۳۷)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مالی قربانیاں انہی سارے احکامات کی بجاآوری تھیں۔ اُن کی قربانیوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی قربانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ جن پر بہت سی روایات منقول ہیں۔ اُن میں کچھ کا ذکر، نفسِ مضمون کی خاطر، بعد میں آئے گا۔

اقبالؔ کا اگر سارا اردو کلام مدحتِ رسولؐ ہے تو انہوں نے اپنی مختلف نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصافِ حمیدہ پر بھی نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ خدا اور رسولؐ کے بعد صحابۂ کرامؓ پر ایمان لانا اور اُنؓ کی تقلید کرنی بھی ایمان کا جزو ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مالی قربانیوں پر درج ذیل مشہور حدیث منقول ہے اور اقبالؔ نے اسی پوری حدیث کو اپنی نظم "صدیقؓ" میں منظوم کیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ:۔

" حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدسؐ نے صدقہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اتفاقاً اُس زمانہ میں میرے پاس کچھ مال موجود تھا۔ میں نے کہا کہ آج میرے پاس اتفاق سے مال موجود ہے۔ اگر میں ابوبکرؓ سے کچھ بھی بڑھ سکتا ہوں تو آج بڑھ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر خوشی خوشی گھر گیا اور جو کچھ بھی گھر میں رکھا تھا اُس میں سے آدھا لے آیا۔ حضورؐ نے فرمایا: " آخر کیا چھوڑا؟" میں نے عرض کیا: " آدھا چھوڑ آیا ہوں "۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ جو کچھ رکھا تھا سب لے آئے۔ حضرتؐ نے فرمایا: " ابوبکر! گھر والوں کیلئے کیا چھوڑا؟" انہوںؓ نے فرمایا: " اُن کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ آیا " یعنی اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کی برکت اور ان کی رضا اور خوشنودی کو چھوڑ آیا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: " میں حضرت ابوبکرؓ سے کبھی نہیں بڑھ سکتا "۔

(" تاریخ الخلفاء "۔ بحوالہ: " فضائلِ صدقات " حصہ اوّل)

یہ قصہ غزوۂ تبوک کا ہے۔ اُس وقت حضورؐ نے چندے کی خاص طور سے ترغیب فرمائی تھی۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے حوصلوں بلکہ ہمت و وسعت سے زیادہ اعانتیں فرمائیں۔ تبوک مدینہ سے چودہ پندرہ منزل پر تھا۔ یہ جنگ ۹ سنہ ھ میں ہوئی۔ ۸ سنہ ھ میں موتہ کی جنگ میں رومی سردار شرجیل غسانی کو چونکہ زبردست شکست ہوئی تھی اس لئے وہ ہرقل روم سے فوجی مدد لے کر مسلمانوں سے اُس شکست کا بدلہ تبوک میں لینا چاہتا تھا۔ اسی لئے آپؐ نے نہایت وسیع پیمانے پر جنگی تیاریاں کی تھیں حضور اکرمؐ نے بیس دنوں تک رومیوں کا انتظار کیا لیکن عیسائیوں میں لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی اس لئے آپؐ نے بھی پہل نہ کی۔ تبوک کے دورانِ قیام میں سرحدی علاقے کے بے شمار عیسائی سرداروں نے رسول اللہؐ کی اطاعت قبول کر لی اور جزیہ دینا منظور کر لیا۔ تبوک کی جنگ آخری جنگ تھی جس میں آقائے دو جہاں نے خود بنفس نفیس شرکت فرمائی تھی۔ اُس کے بعد حضور اکرمؐ نے کسی جنگ میں حصہ نہ لیا۔

جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیوں اور عطیات کا سوال ہے ابن جوزی کہتے ہیں کہ اس بات پر مفسرین اور فقہا کا اتفاق ہے کہ سورۃ الیل ۹۲ کی درج ذیل آیات ۱۷ اور ۱۸ آپؓ کی شان میں نازل ہوئیں :۔

"وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝ (اور اس دہکتی ہوئی آگ) سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے)"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ :۔

"مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے دیا"۔

حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور عرض کیا :۔

"کیا میں اور میرا مال آپؐ کے سوا اور کسی کا ہے ؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سی روایات میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کے بعد یہ درج ہے کہ :۔

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال میں اُسی طرح تصرف فرماتے تھے، جس طرح اپنے مال میں فرماتے تھے"۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :۔

"جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ مسلمان ہوئے تو ان کے پاس ہزار درہم تھے جو سب حضورؐ کے اوپر خرچ کر دیئے (یعنی حضورؐ کی خوشنودی میں)"۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :۔

"کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر احسان ہو اور میں نے اُس کے احسان کا بدلہ نہ دے دیا ہو۔ ابوبکر رضؓ کا احسان میرے ذمے ہے (جس کا بدلہ نہ دے سکا)۔ حق تعالےٰ شانہٗ خود ہی قیامت کے دن اُس کے احسان کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر رضؓ کے مال نے نفع دیا"۔

("تاریخ الخلفاء"۔ بحوالہ "فضائل صدقات" حصہ اول)

اقبال کا اپنی شاعری کے بیشتر حصہ میں مطمحِ نظر مسلمانوں کے ایمان کو تر و تازہ کرنا اور اُنہیں مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ چنانچہ خیرات اور صدقات کے معاملے میں بھی قرآنی احکامات اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ذہن نشین کرانے کے لئے انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ کی مثال پیش کی۔ اُن کی نظم "صدیق رضؓ" غزوۂ تبوک کے لئے چندہ کے سلسلے میں متذکرہ بالا حدیث کی ہو بہو تلمیح ہے جو درج ذیل ہے :۔

اِک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے — اُس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امینؐ کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ! — اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گذار

کی عرض نصف مال ہے فرزند وزن کا حق
باقی جو ہے وہ ملّتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا | جس سے بنائے عشق ومحبت ہے اُستوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت | ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
مِلکِ یمین ودرہم ودینار ورخت وجنس | اسپ قمر سُم وشُتر وقاطر وحمار
بولے حضور چاہئے فکرِ عیال بھی | کہنے لگا وہ عشق ومحبت کا راز دار
"اے تجھ سے دیدۂ مہ وانجم فروغ گیر | اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے، بُلبل کو پھول بس
صدیق رضؓ کے لئے ہے خدا کا رسول صؐ بس"

("بانگِ درا")

اقبال نے اس نظم کے پہلے ہی شعر میں خیرات وصدقات کے متعلق بُنیادی قرآنی اصول یہ کہہ کر ذہن نشین کرایا ہے کہ "دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار" اس بنیادی اصول کی وضاحت قرآنی آیات اور روایات سے پہلے کی جا چکی ہے۔ خیرات وصدقات کے قرآنی ضابطے کا صرف ایک شق ذیل میں درج کیا جا رہا ہے جس کا اقبال کا ذہن پر بہت گہرا اثر تھا۔ فرمایا خدائے تعالےٰ نے :-

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو"۔ ـــــ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۵)

شاید اقبال کے ذہن میں سورۃ التوبہ ۹ کی متذکرہ بالا آیات ہی تھیں جنہوں نے بالکل آخری عمر میں جھنجھلاہٹ میں اُن سے یہاں تک کہلوا ڈالا کہ ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے

ہے اُن کی نمازوں سے محراب ترش ابرو!

("ضربِ کلیم": "محراب گل افغان کے افکار"، بارھواں بند)

اس شعر کو درج ذیل روایت پر بھی مبنی کہا جا سکتا ہے جو "مشکوٰۃ" میں بخل اور کنجوسی پر منقول ہے۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

"دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک تو بخل، دوسری کنجوسی"

اقبالؔ نے اس نظم کا عنوان "صدیقؓ" اس لئے رکھا ہے کہ مکّہ والوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو "صدّیق" کا لقب دے رکھا تھا۔ عربی زبان میں "صدّیق" کے معنی سچے اور سراپا راستباز کے ہیں۔ جیسے سورۃ یوسف ۱۲ کی آیت ۴۶ میں جب ایک شخص جو حضرت یوسفؑ کے ساتھ زنداں میں قیدی رہ چکا تھا حضرت یوسفؑ سے قید خانہ میں بادشاہِ مصر کے خواب کی تعبیر پوچھنے گیا تو انہیں اس طرح مخاطب کیا :

یُوسُفُ أَیُّهَا الصِّدِّیقُ — یوسفؑ، اے سراپا راستی

اس نظم میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مالی قربانیوں کے ذکر کے ساتھ اقبالؔ نے دوسرے بند کے پہلے شعر میں آپؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفاقت اور آپؐ سے عشق و محبّت کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ اگر آپؓ کی مالی قربانیاں مثالی ہیں تو ایسے وقت میں جبکہ مکّہ میں اسلام کا نام لینا اپنی جان سے ہاتھ دھو ڈالنے کا مترادف تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کا رسولؐ کا رفیق بن کر اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے رہنا بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس دوسرے بند کے پہلے شعر میں "رفیقِ نبوّت" کہکر اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے جس میں اس رفاقت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور خدا نے خود اس رفاقت کو مثال کے طور پر اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جنہوں نے اللہ کی راہ میں نکلنے سے اجتناب کیا اور دُنیوی زندگی سے چمٹ کر رہ گئے۔ قبل اس رفاقت کا ذکر فرمانے کے خُدا نے ایسے لوگوں سے جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیتے ہیں اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے

لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دُنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا، اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اُٹھائے گا، اور تم خدا کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (سورۃ التوبہ ۹ رکوع ۶)

اپنی بیزاری کا اظہار کر چکنے پر خدا نے ایسے لوگوں کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کو اللہ کی راہ میں نکلنے والوں اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کو پسند کرنے والے میں مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

• تم نے اگر نبیؐ کی مدد نہ کی تو کچھ پرواہ نہیں، اللہ اُس کی مدد اُس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اُسے نکال دیا تھا، جب وہ (محمدؐ) صرف دو (محمدؐ اور ابوبکرؓ) میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں (حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ) غار (جبلِ ثور) میں تھے۔ جب وہ (رسول اللہؐ) اپنے ساتھی (حضرت ابوبکرؓ) سے کہہ رہا تھا کہ: "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اُس وقت اللہ نے اُس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اُس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔ اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔ نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔"

(سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۶)

اقبالؔ نے اِس نظم میں حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیوں کے ساتھ اُنؓ کے اُس جذبۂ ایمانی کا ذکر بھی کیا ہے جو ایک سچّے عاشقِ رسولؐ کی پہچان ہے۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے متذکرہ بالا سورۃ "التوبہ ۹" کی ساری آیات کو "رفیقِ نبوت" کہکر ذہن نشیں کرایا ہے۔

اس رفاقت کا تعلق رسول اللہ کی زندگی کے اُس دور سے ہے جب مکّہ میں دعوتِ حق زور پکڑنے لگی تو کافروں نے ایک جلسہ کیا اور بہت سے مشوروں میں ابوجہل کا یہ مشورہ طے پایا کہ آج رات محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔ اور اگر قتل کیا جانا ممکن نہ ہو تو گرفتار کر لیا جائے جس پر سو اونٹ کے انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔ اِن باتوں کی خبر بذریعہ وحی، رسول اللہؐ کو ہو گئی

اور اس کا ذکر آپؐ نے صرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ سے کیا۔ اس رات آپؐ نے اپنے حجرے میں حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سُلا دیا اور مکان کے باہر حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ نکلے حالانکہ آپؐ کے مکان کا محاصرہ اُس وقت تک کیا جا چکا تھا۔ مگر سبھوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اس لئے کہ آنحضرتؐ نے ایک مشتِ خاک پر سورۃ یٰسین ۳۶ کی اول آیات لَا یُبْصِرُوْنَ تک پڑھکر اُن کے سروں پر ڈال دیا تھا۔ یہ دونوں ایک غار میں، جو جبل ثور میں تھا، چھپ گئے اور تین دن اور رات اس میں چھپے رہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ آپ دونوں کو روزانہ چھپ کر کھانا دے جاتیں اور آپؓ کا نوکر عامر بن فہیرہ روزانہ بکریاں چرانے کے بہانے رات کو دس بکریوں کے ساتھ رہ جاتا تاکہ اُن کو دودھ دے سکے۔

غارِ ثور میں تین دن و رات رفاقت رکھ کر بعد دونوں دو اونٹ پر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سراقہ بن مالک ابن جعشم، جس نے انعام کی لالچ میں آپؐ کو گرفتار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، آپؐ کا تعاقب کرتا ہوا راستہ میں آگیا۔ آنحضرتؐ نے بددعا کی اور اُس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نے مجبور ہو کر آنحضرتؐ سے امان مانگی اور آپؐ نے اُس کو امان دے دی۔ سراقہ وہیں سے لوٹا اور راستہ میں جو بھی آپؐ کے تعاقب کو جا رہا ہو اُسے لوٹاتا گیا۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ نے مکّہ سے ہجرت کی اور حضرت ابو بکرؓ نے رفاقت کا فیصلہ کر لیا، تو آپؓ نے اپنا تمام مال جو آپؓ کے پاس تھا لادا اور آپؓ کے ساتھ کل مال پانچ چھ ہزار درہم تھا۔ اس کو لے کر رسول اللہؐ کے ساتھ آپؓ غارِ ثور چلے گئے۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ:-

"آپؓ (حضرت ابو بکرؓ) کے اس فعل پر آپؓ کے والد حضرت ابو قحافہؓ نے (جو بعد میں مسلمان ہوئے) کہا کہ: "ابو بکر تم سب کو اپنا مال اور اپنی ذات سمیت مبتلائے مصیبت کر گیا ہے" میں نے کہا: "اے میرے دادا جان! ہرگز ایسا نہیں ہے۔ وہ ہم لوگوں کیلئے خیر کثیر چھوڑ گئے ہیں۔ حالانکہ خدا کی قسم انہوں نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔"

جہاد فی سبیل اللہ میں حضرت ابو بکرؓ کے خرچ کرنے کا یہ عالم تھا کہ روایت ہے کہ:-

"آپؓ (حضرت ابوبکرؓ) مکہ میں رقم ادا کر کے غلاموں کو آزاد کراتے تھے۔ انؓ کے اس فعل پر انؓ کے والد نے انؓ سے کہا کہ: "بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہ رقم خرچ کرتے تو وہ تمہارے لئے قوّتِ بازو بنتے" اِس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے کہا کہ: "ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے یہاں ہے"۔

ایسے ہی بے لوث اور بے غرضانہ عمل کو اقبالؔ نے ایک کُلیّہ بنا کر "بالِ جبریل" کی غزل ۵ (جو لندن میں لکھی گئی) کے درج ذیل ہے شعر میں ذہن نشین کرایا ہے ؎

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر

اور پھر اسی کُلیّہ کو اقبالؔ نے ۱۹۰۵ء کے قبل جب وہ لاہور کے مقامی کالج کے طالب علم تھے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کو روانہ بھی نہ ہوئے تھے "بانگِ درا" کی غزل (حصہ اوّل) کے درج ذیل شعر میں ذرا وضاحت سے اس طرح بھی ذہن نشین کرایا تھا ؎

سوداگری نہیں، یہ عبادت خُدا کی ہے
اے بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

یہ ہیں وہ ساری قرآنی آیات اور روایات حضرت ابوبکرؓ کی جانی و مالی قربانیوں اور عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کی جس کو اقبالؔ نے اِس نظم "صدیقؓ" کے دوسرے بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں "رفیقِ نبوت" اور اسی بند کے چوتھے شعر میں دوسرے مصرعہ میں "عشق و محبت کا رازدار" کہکر سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور قاری یا سامع کو قرآن کی آیات اور حدیث کی روایات میں ان تذکروں کو تلاش کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے کیونکہ شعر کے چھوٹے سے مصرعہ میں اتنی ساری باتیں آ ہی کہاں سکتی ہیں۔

غزوۂ تبوک کے چندہ کے سلسلے میں جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سب کچھ لاکر حضورؐ کے قدموں پر رکھ دیا تو آپؐ کی اِس تاکید پر کہ: "چاہیئے فکرِ عیال بھی" (کیونکہ سورۃ

البقرہ ۲ آیت ۲۱۵ میں بھی تاکید فرمائی گئی ہے) حضرت ابوبکرؓ کا جواب میں یہ کہنا کہ ؎

پروانے کو چراغ ہے، بُلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خُدا کا رسولؐ بس

اِس نظم "صدیقؓ" کا کلیدی شعر ہے۔ قربان جایئے اقبالؔ کے تمثیلی پیرایۂ بیان پر۔ اِس شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے پر اقبالؔ نے درجِ ذیل حدیث کی تلمیح کی ہے جسے حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :۔

"میری مثال اُس شخص کی سی ہے جو آگ روشن کرے۔ اُس میں اِدھر اُدھر سے پروانے اور کیڑے اور مچھر آکر گرنا شروع کر دیں"۔

(تجرید "صحیح بخاری شریف" اُردو۔ نمبر شمار ۱۳۷۶)

اِس نظم "صدیقؓ" کے اِس آخری شعر میں اقبالؔ نے ایمان کا وہی نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے جو انہوں نے "بانگِ درا" ہی کی نظم "جوابِ شکوہ" کے سب سے آخری بند کے شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے۔ یعنی ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اِسی مجموعہ میں ایک مضمون بہ عنوان "نظم "جوابِ شکوہ" (قرآن کی روشنی میں)" شامل ہے جس میں اِس شعر پر قرآنی آیات کے حوالوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر چونکہ نظم "صدیقؓ" کے اِس آخری شعر کے نکتے کو ذہن نشیں کرنے میں کوئی بے ربطی نہ رہ جائے ذیل میں قرآنی آیات پھر سے درج کی جا رہی ہیں کیونکہ اقبالؔ نے نظم "جوابِ شکوہ" کے آخری بند کے مندرجہ بالا آخری شعر میں بھی اِن ہی آیات کی تلمیح کی ہے اور جو دونوں اشعار پر منطبق ہوتے ہیں :۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ : اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور رحیم ہے۔ اِن سے کہو کہ : "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت قبول کرو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے

۔ محبت کرے، جو اُس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں "۔۔۔۔۔۔

(سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے دراصل خُدا کی اطاعت کی۔ اور جو مُنہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں (نبیؐ) اُن لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے "۔۔۔۔۔۔

(سورۃ النساء ۴۔ آیت ۸۰)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی جان اور مال سے ایسے نازک وقت میں جہاد کیا جب کلمہ گویوں کی جانوں کے لالے پڑ رہے تھے۔ مگر اُن کی یہ ساری قربانیاں اُس کی عظیم الشان کامیابی کی خواہشمند تھی جس کا وعدہ خُدا نے رسولؐ کے رفاقت کاروں سے کیا ہے اور ایسے ہی رفاقت کی تلقین اقبالؔ نے اس نظم "صدیقؓ" میں مجموعی طور پر کی ہے۔ ارشاد ہے :۔

۔ بخلاف اس کے (یعنی اُن لوگوں کے جو جہاد سے جی چُراتے ہیں اور دنیوی زندگی ہی میں مست ہیں) رسولؐ نے اور ان لوگوں نے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں اُنہی کے لئے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے انکے لئے ایسے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی (ذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ)"۔۔۔۔۔۔

(سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۱)

حضرت عائشہ رضؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ :۔

"حضرت ابو بکرؓ وفات پا گئے۔ نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ کوئی درہم۔ اور اس سے پہلے بیت المال سے جو حق لیا تھا اُس کو بھی بیت المال میں لوٹا دیا۔" (حیات الصحابہؓ)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مالی قربانیوں پر ایک اور روایت اقبالؔ کی اِس نظم "صِدّیقؓ" اور اِس مضمون کی مقصدیت پر شاید اُن مسلمانوں کے ذہنوں میں کچھ ہلچل ڈالے جن کے "صوفے ہیں افرنگی" اور "قالین ہیں ایرانی"۔ کیونکہ اس روایت کا اطلاق

اقبالؔ کے اِس مصرعہ پر بھی ہوتا ہے کہ: " سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کا رہا شانِ امارت میں " حضرت عطاؒ بن سائب فرماتے ہیں کہ خلیفۃ الاسلام کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد :-

" جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کی گئی، صبح ہی صبح اپنے بازو پر چادریں لادکر آپؓ بازار جارہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " کہاں کا ارادہ فرمایا؟ "

" بازار کا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: " وہاں آپؓ کیا کریں گے؟ آپ تو مسلمانوں کے خلیفہ ہوتے ہیں۔" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " میں اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " آپ تشریف لے چلئے۔ آپؓ کے لئے حضرت ابوعبیدہ وظیفہ مقرر کردیں گے۔" چنانچہ حضرت ابوعبیدہ کے پاس دونوں آئے۔ اُنھوں نے کہا: " میں آپ کے لئے مہاجرین کے ایک درمیانی درجے کے آدمی کے برابر روزینہ مقرر کرتا ہوں اور سردی اور گرمی کا لباس۔ جب ان میں سے کوئی بوسیدہ ہوجائے آپ اُسے لوٹا دیجئے اور اُس کی جگہ دوسرا لے لیجئے۔ چنانچہ اُنہوں نے روزینہ میں آدھی بکری اور ایک چادر جو سر پہ اوڑھی جائے اور ایک تہہ بند جو پیٹ پر باندھا جائے مقرر کیا۔"

(بحوالہ: " حیاتُ الصّحابہؓ ")

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اِن جانی اور مالی قربانیوں پر حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ:-

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ ہم چُستی اور سستی دونوں میں سمع وطاعت پر قائم رہیں گے۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں خرچ کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے منع کریں گے۔ اللہ کی خاطر حق کی بات کہیں گے۔ اور اِس معاملے میں کسی کی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔"

(" مُسند احمد ")

اقبالؔ نے اتنی لمبی نظم "صدیقؓ" صرف ایک روایت (بہ سلسلۂ غزوہ تبوک) اِس لئے رقم کی چونکہ وہ مسلمانوں کے اذہان کو اُس معاشی نظام کی طرف مبذول کرانا چاہتے تھے جو دینِ اسلام کی روح ہے۔ اقبالؔ اُس معاشی نظام سے نالاں تھے جو مغربی سامراجیوں اور مفکرین نے دُنیا پر مسلط کر رکھا تھا جس کے شکار زیادہ تر مسلمان تھے۔ اِس معاشی نظام کی مذمت اقبالؔ نے جن الفاظ میں کی ہے وہ اِسلامی معاشی نظام کو سمجھنے اور دونوں کے بیچ فرق کو ذہن نشیں کرنے میں خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ کہتے ہیں:۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی! | مغرب کے خداوند درخشندہ فلزّات
یورپ کے بہت روشنیِ علم و ہنر ہے | حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں | گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے | سود ایک کا، لاکھوں کیلئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت | پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

"بالِ جبریل": نظم "لینن (خدا کے حضور میں)"

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب ہوا تو اقبالؔ نے ٹھنڈی سانس لی کہ اب اِس فرسودہ معاشی نظام کی بیخ کنی کا وقت آگیا ہے۔ اقبالؔ اشتراکیت کے حامی نہ تھے اور نہ کوئی مسلمان ہو سکتا ہے کیونکہ اِس کی اساس ہی لادینیّت پر قائم ہے۔ چنانچہ اِسی روسی انقلاب کی وجہ سے، بدلتے ہوئے حالات میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو پھر اُسی معاشی نظام کی یاد دلائی جو اِس مضمون کا عنوان ہے ؎

جو حرفِ "قُلِ العَفوَ" میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

("ضربِ کلیم": "اشتراکیت")

چونکہ نظم "صدّیقؓ" کے پہلے ہی شعر کا یہ کلیدی مصرعہ ہے کہ: "دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار" اِس لئے اِس مضمون کو اقبالؔ ہی کے درج ذیل شعر پر ختم کرنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ یہی نکتہ وہ اس شعر میں بھی ذہن

نشیں کراتے ہیں ؎

یہ مال، یہ دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!
("ضرب کلیم: نظم: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ")

علمِ خاص اور اللہ کی مصلحتیں

اس عنوان کے تحت اقبالؔ کا درج ذیل شعر پیش ہے ؎

"کشتیِ مسکیں" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"

علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

(بانگِ درا" : نظم "خضرِ راہ ۔ شاعر")

نظم "خضرِ راہ" کے اِس شعر کا پس منظر دریا کا ساحل ہے جہاں شاعر (اقبالؔ) نے حضرت خضرؑ کو دیکھا اور اُن سے گفتگو کی ۔ شاعر چونکہ "شہیدِ جستجو" اور "جویائے اسرارِ ازل" تھا اس لئے اُس نے حضرت خضر علیہ السّلام سے بہت سے سوالات کئے جن میں ایک سوال اِس شعر میں مذکور تین واقعات کی مصلحتوں کو دریافت کرنا تھا ۔ اقبالؔ نے اُنؑ سے اتنے سارے سوالات اِس لئے کر ڈالا کہ اُنؑ کا علم حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے بڑھا ہوا تھا جس کا ثبوت خود قرآن ہے ۔ اس ثبوت میں اقبالؔ نے ان تین واقعات کا ذکر کر کے خُدا کی مصلحتوں کو ذہن نشین کرایا ہے جن کی تفصیل سورۃ " الکھف" ۱۸ کے رکوع ۹ اور ۱۰ کی درج ذیل آیات میں وارد ہوئی ہے :۔

" (ذرا اِن کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰؑ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ : " میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا" پس جب وہ اُن کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو آگے جا کر موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا : لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں" خادم نے کہا، آپؑ نے دیکھا ! یہ کیا ہوا؟ جب ہم اُس چٹان کے

پاس ٹھیرے ہوئے تھے اُس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپؑ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔ موسیٰؑ نے کہا: "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی"۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے نقشِ قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا (وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا)۔

"موسیٰؑ نے اُس سے کہا: "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اُس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟"۔ اُس نے جواب دیا: "آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اُس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟"۔ موسیٰؑ نے کہا: "ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا"۔ اس نے کہا: اچھا، اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ سے ذکر نہ کروں"۔

"اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اُس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی؟"۔ اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟ موسیٰؑ نے کہا: "بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیئے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں"۔

"پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اُس شخص نے اُسے قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؛ یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا"۔ اُس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے؟"۔ موسیٰؑ نے کہا: "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجیے اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا"۔

"پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا

مانگا مگر انہوں نے اِن دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنا چاہتی تھی۔ اُس شخص نے اِس دیوار کو پھر سے قائم کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا: "اگر چاہتے تو اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے"۔ اُس نے کہا: "بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا اب میں تمہیں اُن باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اُسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ رہا وہ لڑکا، تو اُس کے والدین مومن تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے اِن کو تنگ کرے گا۔ اِس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اِس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اِس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔ اور اِس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور اِن کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے یہ حقیقت ہے اُن باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ واقعہ کہاں پیش آیا اِس کی تصریح قرآن میں نہیں کی گئی ہے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا یہ سفر اللہ تعالےٰ کے حکم سے تھا اور اُن کو منزلِ مقصود کی علامت بتادی گئی تھی۔ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک "بندے" سے بتائی گئی ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کا نام نہ تو اِس قصہ میں آیا ہے اور نہ قرآن میں کسی بھی دوسرے موقع پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے خادم کا بھی نام نہیں بتایا گیا ہے۔ حدیث میں اُن کا نام یوشع ابنِ نون درج ہے جو بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے خلیفہ ہوئے۔ اِس "بندے" کا نام معتبر احادیث میں حضرت خضر علیہ السلام بتایا گیا ہے۔ جس کی تصدیق تجرید" صحیح بخاری شریف" (اردو) کے عنوان: "کتاب علم کا بیان" کے نمبر شمار ۱۰۲ سے بھی ہوتی ہے جو درج ذیل

ہے۔ حضرت ابن ابی کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :۔

"(ایک دن) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ : "موسیٰ علیہ السلام ایک دن وعظ فرمانے کے واسطے کھڑے ہوئے۔ (اثناء وعظ میں) کسی شخص نے عرض کیا" یا نبی اللہ دنیا میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟ انھوں نے فرمایا: " سب سے زیادہ عالم میں ہوں"۔ اُن کے اس کلام پر اللہ تعالےٰ کا عتاب نازل ہوا کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا حوالہ نہ کیا کہ (اس کو خدا ہی جانتا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی نازل فرمائی کہ : "موسیٰؑ، تم سے زیادہ جاننے والا ہمارا ایک بندہ ہے جو مجمع البحرین میں رہتا ہے"۔ موسیٰؑ نے عرض کیا: " یارب میں اُن سے کس طرح ملاقات کر سکتا ہوں۔ وہ مجھ کو کہاں ملیں گے؟" فرمان ہوا کہ: "تم اپنی زنبیل (تھیلے میں) مچھلی رکھ لو جس مقام پر وہ مچھلی غائب ہو جائے وہی اُس شخص کے رہنے کی جگہ ہے"۔ حضرت موسیٰؑ نے اس فرمان کے مطابق فوراً اپنے ہمراہ یوشع ابنِ نون کو لے کر کوچ کر دیا۔ اور اپنی تھیلی میں ایک مچھلی رکھ لی۔ چلتے چلتے (ایک چشمے کے قریب) ایک بڑے پتھر پر دونوں سر رکھ کر سو گئے۔ وہیں مچھلی زندہ ہو کر غائب ہوگئی۔ جب یہ دونوں بیدار ہوئے تو وہاں سے آگے چل دیئے۔ ایک رات دن تک چلتے گئے (راستے میں کسی مقام پر ٹھہرے)۔ موسیٰؑ نے اپنے ہمراہی سے کہا کہ : " ہم تو اب تھک گئے۔ لاؤ ہمارا ناشتہ نکالو (تاکہ آرام لیں) اور کچھ کھا پی لیں"۔ ہمراہی نے کہا کہ: "حضرت، (خوب یاد آیا) جب ہم فلاں مقام پر ایک پتھر کے نزدیک ٹھہرے تھے وہاں ہمارے تھیلے میں سے مچھلی غائب ہوگئی۔ میں بھول گیا"۔ موسیٰؑ نے فرمایا : " ہمارا مقامِ مقصود وہی تھا۔ قدموں کے نشانات پر واپس چلو"۔ الغرض وہاں سے پھر واپس چلے۔ جب اس پتھر کے قریب پہنچے (چشمے کے اندر) ایک شخص کو چادر اوڑھے سوتے ہوئے دیکھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اُن کو سلام کیا۔ حضرت خضرؑ نے (دل میں کہا کہ) اس قسم کا سلام ہماری اس زمین پر مروج نہیں۔ (یہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں)۔ موسیٰؑ نے خضرؑ سے کہا کہ: "میں موسیٰؑ ہوں"۔ خضرؑ نے کہا، " کیا آپ بنی اسرائیل والے موسیٰؑ ہیں"۔ فرمایا : " ہاں، میں وہی

ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہمراہ رہ کر آپ کا علم حاصل کروں۔ کیا آپ مجھ کو اپنے ہمراہ رکھیں گے ؟" خضر علیہ السّلام نے کہا: "آپ میری ہمراہی میں نہ آیئے گا کیونکہ میں ایسے امور کا عالم ہوں جن کو اللہ تعالےٰ نے مجھے ہی تعلیم کیا ہے اور آپ اِس سے بالکل ناواقف ہیں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "نہیں، (اِنشاء اللہ) آپ مجھ کو صابر پائیں گے میں آپ کے کسی امر میں دخل نہ دوں گا (نہ آپ کے کسی حکم کی نافرمانی کروں گا)۔" یہ سن کر حضرت خضر علیہ السّلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ دونوں دریا کے کنارے کنارے چل دیئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو ایک کشتی دکھائی دی۔ دونوں حضرات نے کشتی والوں سے اپنے سوار ہونے کی التجا کی۔ اِن لوگوں نے حضرت خضر علیہ السّلام کو پہچان لیا۔ چنانچہ دونوں کو بلا کر انہیں اپنی کشتی پر سوار کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دو ایک چونچیں پانی پیا اور اڑ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: "موسیٰ، ہمارے تمہارے علم خداوند تعالےٰ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جس طرح چڑیا کی چونچوں کا پانی اِس دریا کے مقابلہ میں۔" اِس گفتگو کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی کے تختوں میں ایک تختہ نکال ڈالا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "اس قوم نے تو ہم کو اپنی کشتی پر بلا کرایہ سوار کیا۔ تم نے اُن کی کشتی کا تختہ نکال کر اس کو ناقص بھی کیا اور اہلِ کشتی کو غرق بھی کرنا چاہا۔" حضرت خضر علیہ السّلام نے کہا کہ: "میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے ہمراہ صبر نہ کر سکو گے۔" موسیٰ علیہ السّلام نے کہا: "میں بھول گیا تھا۔ آپ معاف کیجئے مجھ کو اپنی ہمراہی سے (محروم رکھ کر) تکلیف نہ دیجئے۔ (اب ایسا نہ ہوگا) الغرض وہاں سے یہ لوگ چلتے ہوئے ایک مقام پر آئے جہاں لڑکوں کے ساتھ ایک لڑکا کھیل رہا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اُس لڑکے کا سر پکڑ کر توڑ ڈالا۔ موسیٰ علیہ السّلام نے کہا کہ: "تم نے اپنے سر ایسے کا خون لیا جو بالکل بے قصور تھا۔ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا۔" خضر علیہ السّلام نے کہا: "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ہمراہ آپ سے صبر نہ ہو سکے گا۔" خیر وہاں سے بھی آگے چلے۔ ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ وہاں کے رہنے والوں سے اُن لوگوں نے کھانا طلب کیا۔ اُن سب نے انکار کر دیا۔ یہ لوگ چل دیئے۔ راستے میں ایک دیوار گرنے کے قریب دیکھ کر حضرت خضر علیہ السلام نے

اشارے سے سیدھی کر دی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ: "کاش تم اُس دیوار کی سیدھی کرائی کی مزدوری ہی لے لیتے تو اچھا ہوتا۔" حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ: "بس، اس مرتبہ میری اور آپ کی جدائی ہے۔"

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"کاش موسیٰ علیہ السلام صبر کر لیتے تو ہم کو اِن دونوں کے واقعات اور بھی معلوم ہو جاتے۔"

قرآن مجید کی تذکرہ بالا آیات اور حدیث میں جس پس منظر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر فرمایا گیا ہے اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گوشۂ دل میں اِک جانِ اضطراب چھپا رکھا تھا اقبالؔ نے اُسی طرح پس منظر میں نظم "خضرِ راہ" شروع کی ہے اور اپنے اضطراب کا اظہار بھی کچھ ویسا ہی کیا ہے۔ پہلے بند میں ان باتوں کی ترجمانی دیکھئے:۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اِک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارہ میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار — موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر — انجم کم ضَو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر — جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل — چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اِس قصہ کا ماحصل جو اقبالؔ ان تینوں واقعات کا، زیر تجزیہ شعر میں، تلمیح کے طور پر ذہن نشین کراتے ہیں وہ پہلے تو یہ کہ دُنیا میں جو واقعات شب و روز رونما ہوتے رہتے ہیں وہ کیسے اور کن مصلحتوں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اس کا علم صرف خُدا کو ہے اور یہ بھی کہ واقعات کا ظاہر اُن کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا اپنے

مقرب بندوں کو ہی، جسے چاہتا ہے، اِس علم خاص سے نوازتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کوئی شخص "جویائے اسرارِ ازل" ہے تو: "چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب"۔

بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور "مجمع البحرین" سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور بحرالازرق آکر ملتی ہیں۔

اقبالؔ کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات

اقبالؔ افلاک کی شاعر تھے اور اس درجہ تک پہنچنے میں قرآن مجید کا مطالعہ اور مولانا روم سے انتہائی عقیدتمندی ہی اُن کی ممد و معاون رہی۔ چونکہ قرآن ایک دستورِ حیات ہے اِسی لئے اقبالؔ نے اپنے پورے کلام میں اِس دستور کے ایک ایک شِق کو الگ الگ اشعار میں پرو کر مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کو ترو تازہ کرنے، اُن کے فکر و عمل میں مُثبت تبدیلی لانے اور نتیجتاً اُن کی معاشرتی اصلاح کرنی ہی اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔ اُن کے لئے شاعری "جزویست از پیغمبری" تھی اور اُن کا کلام "پیغام سروش"۔ شعر و شاعری پر اُن کا اصولی طور پر مطمحِ نظریہ تھا کہ:۔

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری.....
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیلؑ ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سُخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

("بانگِ درا"؛ "شاعر")

اقبالؔ جب یہ کہتے ہیں کہ: "شانِ خلیلؑ ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں"

تو وہ سورۃ الشُّعَرَآءِ ۲۶ کے رکوع ۱۱ کی درج ذیل آیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جن میں کفّارِ مکّہ کے اس الزام کا جواب دیا گیا ہے۔ کہ حضورؐ شاعری کرتے ہیں:۔

"رہے شُعراء، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں ۔ بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب اُن پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔"

ان آیات میں شُعراء کی عام مذمت سے اُن شُعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں ۔ اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں، دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں اور چوتھے یہ کہ وہ ذاتی اغراض کے لئے تو کسی کی ہجو نہ کریں ۔ البتّہ جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لئے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان ہی سے کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے ۔ ایسے ہی صفات سے مُتّصف شعراء کے کلام میں بقولِ اقبالؔ "شانِ خلیلؑ" پیدا ہوتی ہے ۔

ایسے تو قرآنی اصطلاحات سے اقبالؔ کا اردو کلام بھرا پڑا ہے مگر اس مضمون میں ایسی چند اصطلاحات ہی پیش کی جا رہی ہیں ۔

۱۔ متاعِ غرور :۔

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں! لاالٰہ الاّ اللہ

"ضربِ کلیم" : لاالٰہ الاّ اللہ!

"متاعِ غرور" کی اصطلاح سورۃ "آل عمران ۳" کی درج ذیل آیت ۱۸۵ سے ماخوذ ہے:۔

"آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دُنیا تو یہ محض ظاہر فریب چیز ہے (وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ)"۔

اقبال نے "متاعِ غرور" کی اصطلاح لا کر مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں انھیں آخری نتائج سمجھ بیٹھنا اور انھیں حق و باطل اور فلاح اور خسران کے فیصلے کا مدار مان لینا درحقیقت "فریب سود و زیاں" میں مبتلا ہو جانا ہے۔ دُنیا میں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہے تو لازمی طور پر اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردودِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ اعتبار آخروی نتائج کا ہونا چاہیئے۔

"متاعِ غرور" کا شکار وہی ہوتے ہیں جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ "متاعِ غرور" کی نفسیات کو قرآن میں اس طرح بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے :۔

"نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے :

واافسوس! ہم سے اِس معاملہ میں کیسی تقصیر ہوئی" اور اِن کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا بُرا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔ دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل ایک تماشہ ہے۔ (وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ) ۔حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لو گے (اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ)"۔۔ سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۴)

"ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفا کار ہے، اور اِن سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے، اِس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے (اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ) ۔جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں (قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ) عنقریب ہم اُس کی سونڈ پہ داغ لگائیں گے"۔۔ (سورۃ القلم ۶۸۔ رکوع ۱)

"متاعِ غرور" میں مبتلا ہوکر اسی انجام بد سے بچنے کے لئے، خدائے تعالیٰ کے اِن ہی ارشادات کے پس منظر میں اقبالؔ نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ ؎

عارضی ہے شانِ حاضر، سطوتِ غائب مُدام
اِس صداقت کو محبّت سے ہے ربطِ جان وتن

(بانگِ درا: نظم "کفر و اسلام")

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ نے پہلے مصرعہ میں "سودا" کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں "سود و زیاں" الفاظ لائے گئے ہیں۔

یہ سبھی الفاظ کاروباری اصطلاحیں ہیں۔ کاروبار میں نفع و نقصان اور اس کا "بیلنس شیٹ" ہی سب کچھ ہے۔ سورۃ الانعام۶ کے رکوع ۴ کی مندرجہ بالا آیات میں بھی "نقصان میں پڑ گئے" اور "زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں" جیسے فقرے وارد ہوئے ہیں جن سے مُراد "متاعِ غرور" کی سوداگری کے نفع و نقصان کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ تجارت یا سوداگری وہ چیز ہے جس میں آدمی اپنا مال، وقت، محنت اور ذہانت و قابلیت اس لئے کھپاتا ہے کہ اُس سے نفع حاصل ہو۔ مگر اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اصل سوداگری اور تجارت تو ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہے جن میں اگر اپنا سب کچھ کھپاؤ گے تو تمہیں نفع حاصل ہوگا جس کا وعدہ خُدا نے درج ذیل آیات میں کیا ہے۔ جس میں دنیوی اور اُخروی دونوں خوش حالیاں شامل ہیں:۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو میں بتاؤں تم کو وہ تجارت (تِجَارَۃٍ) جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو (ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ) اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی (ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ)۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، وہ بھی تمہیں دے گا، اللہ کی طرف سے نُصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ" اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ)" ——

سورۃ الصّف ۶۱ ـ رکوع ۲۔

انہی آیات کی ترجمانی اقبال کے اِس شعر میں ملتی ہے ؎

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
("بانگ درا": غزلیات حصہ دوم)

یا پھر یہ شعر ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بیخبر، جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے
("بانگ درا": غزلیات حصہ اوّل)

---

(۲) خلق عظیم:

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خُلقِ عظیم" صاحبِ "صدق و یقیں"
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!
("بال جبریل": نظم "مسجد قرطبہ")

"خلق عظیم" کی اصطلاح قرآن میں صرف ایک جگہ اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں سورۃ "القلم ۶۸" رکوع ۱ میں وارد ہوئی ہے جو درج ذیل ہے اور اقبال نے اس اصطلاح کو داد ین میں دیا ہے:-

"ن ہے۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لئے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک تم اخلاق

کے بڑے مرتبے پر ہو (وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ)۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ :۔

"کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنُ (قرآن آپ کا اخلاق تھا)"

امام احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور ابن جریر نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا یہ قول متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ خود خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے اخلاق مکرمہ پر سورۃ "آل عمران" کی آیت ۱۵۹ میں اس طرح خراجِ تحسین فرمایا ہے :۔

"اے پیغمبرؐ۔ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں"۔

اقبالؔ نے ان ہی آیات کی ترجمانی "بال جبریل" کی غزل ۱۱ کے درج ذیل شعر میں کی ہے ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق!

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے :-

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین قسم کے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں"

---

(۳) سلسبیل :

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

(بانگِ درا: نظم "خضرِ راہ - صحرانوردی)

"سلسبیل" قرآن میں صرف ایک بار سورۃ "الدھر" کی آیت ۱۸، رکوع ا میں وارد ہوا ہے۔ اقبالؔ کی یہ تلمیح اسی آیت سے ماخوذ ہے جو درجِ ذیل ہے یہ اس شعر میں انہی معنوں میں لایا گیا ہے جن معنوں میں یہ قرآن میں وارد ہے :-

"اُن کو (ابرار - نیک لوگ) وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنّت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے (عَیْنًا فِیْهَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا)"

اہلِ عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لئے فرمایا گیا کہ وہاں اُن کو ویسی ہی شراب پلائی جائے گی۔ لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اُس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی مگر اس کی تلخی نہ ہوگی۔ اس لئے اُس کا نام سلسبیل ہوگا۔ سلسبیل سے مُراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔ مفسّرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اُس چشمے کے لئے بطورِ صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطورِ اسم۔

اقبالؔ نے نظم "خضرِ راہ" ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی جب کہ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے خاتمہ پر ساری دنیائے اسلام پر مغربی سامراجیوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور مسلمان مقہور و مجبور ہو

کر اُن سے رحم کی درخواست کرتے پھر رہے تھے۔ اقبالؔ نے یہ نظم انجمنِ حمایت اسلام، لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سُنائی تھی اور سُننے والوں کا بیان ہے کہ جب وہ اِس نظم کو پڑھ رہے تھے تو وفورِ جذبات سے اکثر پڑھتے پڑھتے رُک جاتے تھے اور گلوگیر ہو جاتے تھے۔ جب اُنہوں نے اِس نظم کا یہ شعر پڑھا ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

تو راویوں کا بیان ہے کہ بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور خود اقبالؔ کا تو یہ حال تھا کہ روتے روتے گھگھی بندھ گئی۔ اِس نظم میں اقبالؔ نے مسلسل جدوجہد کی تلقین کی ہے اور خضر کی صحرانوردی سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حرکت اور صحرانوردی سے زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آتی ہیں اور جس کے سر میں سودا ہوتا ہے وہ ہمیشہ نئے مقامات کی تلاش میں لگا رہتا ہے نہ کہ بے مقصد زندگی بسر کرتے ہیں۔

زیرِ تجزیہ شعر، جس میں "سلسبیل" کی تلمیح کی گئی ہے اُس کا پس منظر یہ ہے کہ اس نظم میں اقبالؔ کو ساحلِ دریا پر خضر سے ملاقات ہوگئی اور اُن سے بہت سے سوالات کئے۔ جس میں ایک سوال یہ تھا کہ ؎

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

خضر نے اِسی سوال کا جواب دیا جس جواب میں زیرِ تجزیہ شعر بھی شامل ہے۔ اُن کا جواب یہ تھا۔

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیلؑ

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش — اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبالؔ نے اِن اشعار میں ایک متحرک کارواں کی تصویر کشی کی ہے جس کی جامِ زندگی گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے اور وہ مسلمانوں کو دوامِ زندگی کے اِسی راز کو ذہن نشین کراتے ہیں اور تمثیلی پیرایۂ بیان میں اِس کارواں کی دن بھر "گردشِ پیہم" کے بعد اُن کا پانی کے چشمے کے گرد جمع ہو جانے کی تمثیل جنت میں اہلِ ایماں کے سلسبیل کے چشمے کے گرد جمع ہونے کی دیتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے بھی دُنیا کے کارواں میں رہ کر "دوامِ زندگی" کا راز پالیا تھا جس کا بدلہ اُنہیں عطا فرمایا جا رہا ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا بند میں پانچویں شعر میں "چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ" کا ذکر آیا ہے۔ جو تلمیح ہے سورۃ "الانعام" آیات ۷۴ تا ۷۹، جس پر تفصیلی روشنی، قرآن کی رو سے، اسی مجموعہ کے مضمون "نظم جوابِ شکوہ (قرآن کی روشنی میں)" کے پچیسویں بند میں ڈالی گئی ہے جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

---

۴) صاحبِ مازاغ:

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ

(ضربِ کلیم، غزل (بعد از نظم "اساتذہ"))

اقبالؔ نے "مازاغ" کی تلمیح سورۃ "النجم ۵۳، رکوع ۱" سے لی ہے جس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج سے ہے:-

"وہ (حضرت جبریلؑ) سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی اُفق پر تھا، پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اُس نے اللہ کے بندے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اُسے پہنچانی تھی۔ نظر نے

جو کچھ دیکھا، دل نے اُسے جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدرۃُ المنتہیٰ کے پاس اُس کو اُترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنّت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی (مَازَاغَ البَصَرُ) اور نہ حد سے متجاوز ہوئی (وَمَاطَغیٰ) اور اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

"مَازَاغَ البَصَرُ" کی مندرجہ بالا آیت حضرت جبرئیل علیہ السلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ملاقات کے سلسلہ میں نازل ہوئی جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس ملاقات کا مقام "سدرۃ المنتہیٰ" بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے قریب "جنّتُ الماویٰ" ہے۔ "سدرہ" عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں اور "مُنتہیٰ" کے معنی ہیں آخری سرا۔ "سدرۃَ المُنتہیٰ" کے لغوی معنی ہوئے: "وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سرے پر واقع ہے"۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عالمِ مادی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیا ہے اور اسی کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے "روح المعانی" میں اس کی تشریح یہ کی ہے کہ: "اس پر ہر عالم کا علم ختم ہو جاتا ہے، آگے جو کچھ ہے اُسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ اس کے اسرار کو جاننا ناممکن ہے۔

"جنّتُ الماویٰ" کے لغوی معنی ہیں "وہ جنّت جو قیام گاہ ہے"۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی جنت ہے جو آخرت میں اہل ایمان و تقویٰ کو ملنے والی ہے اور یہ کہ یہ آسمان میں ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد وہ جنّت نہیں ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے۔ ابنِ عباسؓ بھی یہی کہتے ہیں اور اس پر وہ یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ آخرت میں جو جنت اہلِ ایمان کو دی جائے گی وہ آسمان میں نہیں ہے بلکہ اُس کی جگہ یہی زمین ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

"اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی (اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا)" سے مُراد سدرہ کی شان، اِس کی کیفیات اور تجلیات کا بیان فرمانا ہے جن کا نہ تو کوئی انسان تصور کر سکتا ہے اور نہ زبان اس کے وصف کی متحمل ہو سکتی ہے۔ مگر ایسی تجلیات کے سامنے بھی

رسول اللہؐ کی آنکھیں نہ تو چندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئیں اور آپؐ پورے سکون سے اسے دیکھتے رہے۔

اقبالؔ نے اِس شعر کے پہلے مصرعہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے کہ تو اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے مغربی قوموں کے مادّی عروج کا خواہاں ہے اس لئے کہ "فروغِ مغربیاں" یعنی مغربی قوم کے اِس مادّی عروج نے تیری آنکھوں کو خیرہ یعنی چُندھیا دیا ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں دعا کرتے ہیں کہ خُدا کرے تیری آنکھوں کا نگہبان "صاحبِ مازاغ" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو جائیں یعنی تو عاشقِ رسولؐ ہو کر اپنی آنکھوں میں وہی قرار پیدا کرے جو کسی چمکتی یا خیرہ کرنے والی چیز سے چکاچوندھ نہ ہو جائے جس طرح آپؐ نے سِدرہ کی ساری تجلیات کو پرسکون کیفیت میں دیکھا اور آپؐ کی آنکھیں نہ چُندھیائیں نہ حد سے مُتجاوز ہوئیں۔ اقبالؔ نے اس شعر میں "فروغِ مغربیاں" سے "مادّی نظریہ" اور "صاحبِ مازاغ" سے "اتباعِ رسولؐ" مُراد لیا ہے۔

---

(۵) مقامِ اعراف:

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور

ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف!

("بالِ جبریل": غزل ۶۰)

اِس شعر میں اقبالؔ نے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ حکماء اور فلسفی (جیسے افلاطون) چونکہ عقل کو اپنا رہنما بناتے ہیں اس لئے اُن کے دل میں خُدا کے متعلق یقین کی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اُن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ عقلی دلائل سے کبھی تو اُن کے اندر ہستیٔ باری تعالیٰ پر یقین کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی وہ شک و شُبہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "فلاطوں" سے خاص طور پر افلاطون مُراد نہیں لیا ہے بلکہ اُن کی مُراد پوری خدا پرست حکما اور فلسفیوں سے ہے جو افلاطون کی طرح اللہ کو عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔ اِس مصرعہ میں "غیب" سے مُراد "شک" اور "حضور" سے مُراد "یقین"

ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو اقبال نے دوسرے مصرعہ میں "اہلِ خرد" یعنی عقل والے کہا ہے۔

اس لئے دوسرے مصرعہ میں اقبال یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ ایسے ہی "اہلِ خرد" کا مقام جہاں تک خدا کی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے ازل سے "اعراف" کا مقام رہا ہے یعنی نہ ادھر کے نہ اُدھر کے یہ لفظ "الاعراف" (میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سورۃ کا نام "اعراف" اِس لئے رکھا گیا ہے چونکہ پانچویں رکوع میں ایک مقام پر "اصحابُ الاعراف" کا ذکر آیا ہے جنہیں نہ تو روزِ حشر جنّت میں داخلہ کا حکم ملا ہے اور نہ جن پہ دوزخ میں جھونکے جانے کا حکم صادر ہوا ہے بلکہ وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پہ اس اُمید پہ رہیں گے کہ شاید اُنہیں جنّت کا داخلہ مل جائے۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو اتنا قوی ہو گا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہو گا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اقبال نے اس اصطلاح سے انہی باتوں کو ذہن نشیں کرایا ہے کہ یہ مذبذبت اُن کے ساتھ صرف اِس لئے ہو گا کہ اُنہوں نے خُدا کی حقیقت کو جاننے کی کوشش عقل سے کی نہ کہ دِل سے۔ آیات یہ ہیں:-

"یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جُھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے اُن کے لئے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ اُن کا جنّت میں جانا اُتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ ملا کرتا ہے۔ اُن کے لئے تو جہنّم کا بچھونا ہو گا اور جہنّم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کئے ہیں۔ اور اِس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ اہلِ جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہو گی اُسے ہم نکال دیں گے۔ اِن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے کہ: "تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خُدا رہنمائی نہ کرتا ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔" اُس وقت ندا آئے

گی کہ یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے۔

"پھر یہ جنت کے لوگ (أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ) دوزخ والوں (أَصْحٰبَ النَّارِ) سے پکار کر کہیں گے: "ہم نے اُن سارے وعدوں کو ٹھیک پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کئے تھے۔ کیا تم نے بھی اُن وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے؟"۔ وہ جواب دیں گے: "ہاں"۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ: خدا کی لعنت اُن ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اُسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے امیدوار تھے"۔

"ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی (وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ) جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے (وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ)، یہ ہر ایک کو اُس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ: "سلامتی ہو تم پر" (سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ)۔ یہ لوگ (وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ) جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اُس کے اُمیدوار ہوں گے۔ اور جب اُن کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے: "اے رب! ہمیں اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو"۔ پھر یہ اعراف کے لوگ (أَصْحٰبُ الْأَعْرَافِ) دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو اُن کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ: "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہلِ جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اِن کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا؟ آج اِنہی سے کہا گیا کہ "داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج"۔

"اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں

گے کہ: "اللہ نے یہ دونوں چیزیں اُن منکرینِ حق پر حرام کر دی ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنہیں دُنیا کی زندگی نے فریب میں مُبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انہیں اُسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اِس دن (روزِ حشر) کو بھولے رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے"
—— (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۵ اور ۶)

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ نے "غیب" و "حضور" کے اِن ہی نکتوں کو ذہن نشین کرایا ہے جن کے انجامِ کار کے متعلق مندرجہ بالا آیات میں صریح ارشادات نازل ہوئی ہیں۔ اس شعر کا بُنیادی نکتہ یہ ہے کہ حقیقت رسی کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ دل ہے اور اقبالؔ نے اسی بُنیادی تصوّر پر اپنے فلسفہ کی عمارت تعمیر کی۔ اُن کے نزدیک عقل "خداجو" ضرور ہے لیکن اُسے پا نہیں سکتی کیونکہ خُدا کا پانا عقل کی طاقت سے باہر ہے۔ اِس کے مقابلہ میں "دل" ہی "خُدانما" ہے یعنی دل وہ طاقت ہے جس کی بدولت انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ عقل زمان و مکان کی قید میں رہتی ہے اور کبھی اس قید سے نہیں نکل سکتی لیکن دل عقل کے ان پیدا کردہ تصوّرات کی حدود و قیود کو توڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ عقل خُدا کی ہستی میں شکوک پیدا کرتی رہتی ہے لیکن دل ایسا مکان ہے جہاں خود اللہ رہتا ہے۔ اقبالؔ کی مُراد یہ ہے کہ خدا افلاطونی نظریہ کے تحت عقل کی بدولت نہیں مل سکتا بلکہ "عشق" کا راستہ اختیار کرنے سے ملتا ہے۔ اقبالؔ کے یہ تصوّرات ۱۹۰۵ء کے قبل لاہور کے مقامی کالج کے طالب علمی کے زمانے میں ہی اُن کے دل پر نقش ہو چکے تھے۔ چنانچہ اُسی زمانہ کی نظم "عقل و دل" (جو مکالمہ کے طور پر ہے) میں اس نکتہ کو اِس طرح وہ ذہن نشین کراتے ہیں:-

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں مُفسّرِ کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
دل نے سُن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مُجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے دیکھتا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے | تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی | اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی | حُسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا | طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

("بانگِ درا")

اسی حقیقت کو قریب پچیس سال بعد اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

("ضربِ کلیم": نظم "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ")

اسی زمانہ میں اِسی نکتہ کو اور بھی ذرا سا سنجیدگی سے روشنی ڈال کر زمانۂ حاضر کے انسان پر یہ طنز کیا ہے:-

"عشق ناپید و خرد مے گزدش صورتِ مار"
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

("ضربِ کلیم": نظم "زمانہ حاضر کا انسان")

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

("ضربِ کلیم": "نظم "عصرِ حاضر")

افلاطون دورِ قدیم کے خُدا پرست حکما کا سرتاج ہے۔ یہ یونان کا فلسفی اور سقراط کا شاگرد تھا۔ یہ ۴۲۷ ق۔م۔ میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ ق۔م۔ میں وفات پائی۔ اس کی مشہور تصنیف "ریپبلک" (جمہوریہ) ہے۔ مگر یہ عقل سے خدا کا قائل تھا نہ کہ دل سے۔ اسی لئے اقبال نے اپنے کلام میں "افلاطون" کی اصطلاح "شک" و "تذبذب" کے

استعمال کیا ہے۔ جیسے اِس شعر میں ؎

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں!

("بالِ جبریل"۔ غزل ۲)

اقبالؔ کا عقل پر دل کی برتری سراسر قرآنی تصوّر ہے اس لئے کہ، قرآن کی رو سے، "دل" ہی سوچ سمجھ کر انسان کو حقیقت تک پہنچانے میں واحد رہنما بنتی ہے۔ دل کے فرضِ منصبی پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

"اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اِس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمہیں کان دیئے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیئے (وَالْاَفْئِدَۃَ)، اِس لئے کہ تم شکر گزار بنو"۔ (سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۸)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سُننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کے لئے دل دیئے (وَالْاَفْئِدَۃَ)۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو،،

—— (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ آیت ۸)

"اس (خدا) نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اُس کی نسل ایک ایسے سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو نک سُک سے دُرست کیا اور اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے (وَالْاَفْئِدَۃَ)۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔

—— (سورۃ السجدہ ۳۲۔ رکوع ۱)

"مشکوٰۃ شریف" میں ایک روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہ:۔

"انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے،،

اقبالؔ جب نظم "عقل و دل" میں دل سے عقل کو یہ جواب دلاتے ہیں کہ:۔

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں

تو وہ صرف مندرجہ بالا آیات ہی کے تصورات کو پیش نہیں کرتے بلکہ اس کی ٹھوس مثال سورۃ النجم ۵۳ کی آیات کی تلمیح سے پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کا ذکر فرمایا گیا ہے اور جب پہلی بار آپؐ نے جو تجلیات دیکھیں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ :-

"نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اُس میں جھوٹ نہ ملایا (مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی)"
—— (آیت ۱۱)

اور جب حضرت جبرئیل علیہ السلام دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اُترے اور آپؐ نے پھر جو تجلیات دیکھیں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ :-

"نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی (مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی —— آیت ۱۷)

یہ ہیں خداشناسی پر وہ سارے نکتے جو اقبالؔ زیر تجزیہ شعر میں ذہن نشیں کراتے ہیں۔ اور انہی ساری قرآنی آیات کے تحت یہ کلیہ مرتب کیا ہے کہ ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لَآ اِلٰہَ اِلَّا
لُغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

("بالِ جبریل"۔ غزل ۲۲)

چونکہ "دل" کا تعلق براہِ راست ایمان سے ہے اِس لئے اس موضوع پر قرآن کی درجِ ذیل آیات کا مطالعہ حاصلِ ایمان ہوگا :-

سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۹ —— سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۲۲
سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱۴ —— سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۲
سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۴ —— سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۵
سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۱۴

"عقل" کو اقبالؔ نے "بولہب" کا نام بھی دیا ہے جس کا ذکر آگے "بولہبی" کے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

---

(۶) مَاعَرَفْنَا :

پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفْنَا پر
ترا رُتبہ رہا بڑھ چڑھ کر سارے نازنینوں میں

("بانگِ درا": غزلیات حصّہ اول)

یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے :۔

"مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ" (اے خدا! ہم نے تجھ کو اِس طرح نہیں پہچانا جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے۔"

---

(۷) دولتِ قارون :

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں!

("بالِ جبریل : غزل ۳)

اِس شعر میں اقبالؔ نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جس شخص کی خودی، تزکیۂ نفس کے ذریعے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے اُس کا قلب منوّر اور مُطہر ہو جاتا ہے، اُس کی نگاہ میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عشقِ الٰہی سے سرشار رہتا ہے۔ اُس کی نظروں میں نہ تو قارون کے خزانے کی کوئی وقعت ہے اور نہ حقیقت شناسی اور خدا شناسی کے لئے وہ حُکما اور فلسفی کے افکار کا محتاج ہوتا ہے۔

چونکہ قرآن میں دُنیاوی دولت سمیٹنے اور اُس پر فخر کرنے کی واحد مثال نام لے کر صرف قارون کی دی گئی ہے اسی لئے اقبالؔ نے بھی اِسی اصطلاح کو دُنیا سے بے رغبتی پیدا کرانے اور فقر کی شان پیدا کرنے کے لئے کُفر کے مترادف قرار دیا جانا مناسب سمجھا۔ اِس اصطلاح سے اُنہوں نے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ اگر کسی کو دُنیوی نعمتیں حاصل ہیں اور وہ اُسے راہِ خُدا میں خرچ نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ نعمتیں تو میں نے اپنی علم کی بنا پر حاصل کی ہیں نہ کہ خدا کے فضل و کرم سے تو اُس کا انجام بھی وہی ہو گا جو قاروں کا خُدا نے دُنیا ہی میں باد

عبرت بنا کر دکھا دیا۔ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا قصّہ سورۃ القصص ۲۸ کے رکوع ۸ اور ۹ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:۔

"یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰؑ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اُس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ اُن کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مُشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اُس کی قوم کے لوگوں نے اُس سے کہا کہ: " پھول نہ جا" اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کر۔ اُحسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔" تو اُس نے کہا: " یہ سب کچھ تو مجھے اُس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔" کیا اُس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اِس سے زیادہ قوّت اور جمعیت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو اُن کے گناہ نہیں پوچھے جاتے؟

"ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے وہ اُسے دیکھ کر کہنے لگے: " کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑا نصیب والا ہے۔" مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: "افسوس تمہارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"

"آخر کار ہم نے اُسے (قارون) اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر کوئی اُس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اُس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود ہی اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اُس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے: "افسوس" ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے

بندوں میں جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس! ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔

"وہ آخرت کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لئے مخصوص کردیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی مُتقین ہی کے لئے ہے (وَ العَاقِبَۃُ لِلمُتَّقِینَ)۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اُس کے لئے اِس سے بہتر بھلائی ہے، اور جو بُرائی لے کر آئے تو بُرائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے ہیں۔ اے نبیؐ، یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے۔ اِن لوگوں سے کہدو کہ: "میرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کھُلی گمراہی میں کون مُبتلا ہے۔"

قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے کے باوجود، جس قوم میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو مبعوث کیا گیا تھا، قارون فرعون کے ساتھ جاملا تھا اور اُس کا مقرب بن کر اِس حد کو پہنچ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مخالفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے اُن میں سے ایک یہی قارون تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

"کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں۔؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت ور تھے اور اِن سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اللہ نے اُن کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ اُن کا انجام اس لئے ہوا کہ اُن کے پاس اُن کے رسول بیّنات لے کر آئے اور اُنہوں نے ماننے سے انکار کردیا۔ آخر کار اللہ نے اُن کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔"

"ہم نے موسیٰ کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور

نمایاں سندِ ماموریت کے ساتھ بھیجا، مگر انہوں نے کہا: "ساحر ہے، کذاب ہے"

(سورۃ المؤمن ۴۰۔ رکوع ۳)

قارون کو اپنی دولت کا فخر تھا اور فرعون کو اپنی سلطنت کا اور خدائی کے دعویٰ کا مگر حشر یہ ہوا کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے اور فرعون نے اپنی لشکروں سے آپؑ کا تعاقب کیا تو ارشاد ہے کہ:۔

"اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے اُن کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں"۔ (جواب دیا گیا): "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اِس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لئے نشانِ عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"

(سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۹)

یہ ہیں وہ سارے قرآنی ارشادات جو اقبالؔ زیرِ تجزیہ شعر میں "دولتِ قارون" کی اصطلاح سے ذہن نشین کراتے ہیں۔ وہ اِس اصطلاح سے بدکردار سیرت اور اندازِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے لوگ ہیں مگر اُن کی سزا اُن کے اپنے اعتراف پر منحصر نہیں ہوتی۔ خدا جب انہیں پکڑتا ہے تو پوچھ کر نہیں پکڑتا کہ تمہارے گناہ کیا ہیں کیونکہ مندرجہ بالا سورۃ القصص ۲۸ کی آیات میں خدا کا یہ فرمان گزر چکا ہے کہ: "مجرموں سے تو اُن کے گناہ نہیں پوچھے جاتے"

---

(۸) بولہبی:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

("بانگِ درا": نظم "ارتقا")

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار
اگر نہ ہو اُمرائے عرب کی بے ادبی!
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمّت کو
وصالِ مصطفویؐ، افتراقِ بولہبی!
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی!

("ضربِ کلیم": نظم: "اُمرائے عرب سے")

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ! عقل تمام بولہب!

("بالِ جبریل" نظم "ذوق و شوق")

پہلے تو "ضربِ کلیم" کی مندرجہ بالا نظم "اُمرائے عرب سے" میں اقبال کا اپنے کو "کافرِ ہندی" کہہ کر اشارہ کرنا تشریح طلب ہے۔ اُنھوں نے اپنے لئے یہ اصطلاح اپنے اردو کلام میں جیسے "بالِ جبریل" کے درجِ ذیل اشعار میں بھی استعمال کی ہے:۔

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

(نظم: "مسجدِ قرطبہ")

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز!

(غزل ۲)

اپنے برہمن زادہ ہونے کی بات ایک فلسفہ زدہ سیّد کو جو وحی کے مقابلہ میں حکمائے مغرب کے خیالاتِ باطلہ کا پیرو ہونے کی وجہ سے دین سے بیگانہ ہو کر اپنی خودی کھو چکا تھا پہلے تو اس طرح مطعون کرتے ہیں کہ ؎

تو اپنی خودی نہ کھوتا = زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی = ہے اُس کا طلسم سب خیالی!

(برگساں انیسویں صدی کے اواخر کا مشہور فرانسیسی فلسفی اور ہیگل انیسویں صدی کے اوائل کا مشہور جرمن فلسفی اور کارل مارکس کا ہم عصر تھا)

اس کے بعد اقبال اس فلسفہ زدہ سیّد زادے کو اپنے برہمن زادہ ہونے کی باتیں گوش گزار کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ برہمن زادہ ہونے کی وجہ کر تو فلسفہ میری گھٹی میں پڑا ہے:۔ مگر میں اس فلسفہ کا قائل نہیں جس کی رہنما عقل ہو:۔

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سُن مجھ سے نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے؟ بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری!

(ضربِ کلیم، نظم "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام")

اقبال جب اپنے کو "کافرِ ہندی"، "برہمن زاد" اور "آبا مرے لاتی و مناتی" کہتے ہیں تو اس کا کچھ مختصر سا تاریخی ذکر قارئین کے لئے خارج از دلچسپی نہ ہوگا کیونکہ اِس سے ہمیں اقبال کے دینی فکر کا بھی پتہ ملتا ہے۔ اقبال کے سب سے مستند سوانح نگار جناب عبدالمجید سالک انکی سوانح موسوم بہ "ذکرِ اقبال" میں اس کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں:۔

"علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیشتر سترہویں صدی عیسوی میں مشرّف الاسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا۔ اِس کا گوت سپرد تھا۔ یہ لوگ سری نگر رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سیّد بزرگ کہیں سے سری نگر تشریف لائے۔ علامہ کے جدِّ اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے کام کیا۔

برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ صالح نام پایا۔ سید صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت دیکھ کر اپنی دختر نیک اختر سے اُس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد فلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے۔

مزار کشمیر میں ہے مگر مقام معلوم نہیں۔ سن ۱۸۵۷ کے ہنگامے فروغ ہونے کے بعد بابا صالحؒ کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بیشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبالؔ کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ اُن کا نام شیخ محمد رفیق تھا مگر وہ شیخ رفیقا کہلاتے تھے۔ کشمیری دھسوں کی تجارت کرتے تھے۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک کا نام شیخ نور محمد (والد علامہ اقبال) و دوسرے شیخ غلام قادر جو نہر کے محکمے میں ملازم تھے اور جن کا انتقال روپڑ (ضلع انبالہ) میں ہوا،..... علامہ اقبال کی ولادت ۲۴ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی۔ والد نے محمد اقبال نام تجویز کیا۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے پاک نفس والد محترم نے جو خواب دیکھا وہ اُنھوں نے خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (پاکستان کے مشہور ماہر اقبالیات) سے یوں بیان کیا:۔

"میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت لوگ کھڑے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے۔ اُس کی دلکشی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنا بازو اُٹھا اُٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اُترا اور میری گود میں آن گرا۔ آپ نے اُس کی تعبیر خود ہی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو گا جو خدمتِ اسلام میں ناموری پیدا کرے گا۔"

اقبال نے "بولہبی" کی اصطلاح سورۃ اللھب ۱۱۱ سے لی ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے: "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ (تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ

وَّتَبَّ)۔ اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے کمایا وہ اُس کے کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ
زن آگ میں ڈالا جائے گا (سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ) اور (اُس کے ساتھ)
اُس کی جورو بھی۔ لگائی بجھائی کرنے والی۔ اُس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔"

اقبالؔ کے کلام میں "بولہبی" سے مُراد صرف کفر اور گمراہی نہیں بلکہ اسلام سے شدید ترین دشمنی ہے۔ اور یہ اصطلاح اُنہوں نے اِس لئے وضع کی چونکہ ابولہب، جو آپؐ کا چچا تھا اسلام کا بد ترین دشمن تھا اور اسی اصطلاحی معنوں میں اُنہوں نے کہا کہ ازل سے "تا امروز" چراغِ مصطفویؐ "(اسلام) کا دشمن شرارِ بولہبی (کفر اور دین کی دشمن) رہی ہے۔ قرآن مجید میں یہ سورۃ اللھب ۱۱۱ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مذمت کی گئی ہے۔ مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار کے بیچ واقع تھے۔ اِس شخص کا اصل نام عبدالعزّٰی تھا اور اسے ابولہب اسی لئے کہا جاتا تھا کہ اُس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ و سفید تھا۔ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رو۔ قرآن میں اُس کا ذکر اُس کے نام کے بجائے اُس کی کنیت سے کرنے کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زیادہ تر اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی کُنیّت سے مشہور تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس کا نام عبدالعزّٰی (بندۂ عزّا) ایک مشرکانہ نام تھا اور قرآن میں یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اُسے اِس نام سے یاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اُس کا جو انجام اِس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ یہ کُنیّت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ چونکہ "بولہبی" سے مُراد اقبالؔ نے "شدید ترین اسلام دُشمنی" لی ہے اس لئے ابولہب کی شدید ترین اسلام دُشمنی پر چند روایات ذیل میں نقل کی جارہی ہے کیونکہ یہ اصطلاح اسی کے نام سے وضع ہوئی ہے۔

ابن عبّاس سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ:۔
"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے تمام خاندانوں کو جمع ہونے کے لئے آواز دی۔ جب سب جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: "اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ

کرنے کے لئے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟" لوگوں نے کہا: "ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔" تو آپؐ نے فرمایا: "میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آرہا ہے۔" اس پر قبل اس کے کہ کوئی بولتا ابولہب نے کہا: تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ (ستیاناس جائے تیرا، کیا اسی لئے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر کھینچ مارے۔"

(مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)

ابن زید کی روایت ہے کہ:-

"ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایک روز پوچھا "اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا: "جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔" اس نے کہا: "میرے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "اور آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس پر وہ بولا تَبًّا لِهٰذَا الدِّيْنِ تَبًّا اَنْ اَكُوْنَ وَهٰؤُلَاءِ سَوَاءً (ناس ہو جائے اس دین کا جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔"

(ابن جریر)

سورۃ الکوثر ۱۰۸ کی پہلی آیت " اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا۔" کا نزول بھی ابولہب کی اسلام اور رسول دشمنی ہی کی وجہ سے ہوا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے۔ اُن سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں۔ اُن سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔ پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں اُمّ کلثومؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا جس پر کفارِ مکہ نے خوشیاں منائیں۔ حضرت عبد بن حمید نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اس وقت بھی ابوجہل نے کہا "محمد ابتر ہیں۔" عطاء کہتے ہیں کہ جب حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا تو ابولہب دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی

کہ "بترمحمدؐ اللیلۃ (آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا اُن کی جڑ کٹ گئی"۔
ایسی ہی انتہائی دل شکن حالات میں سورۃ الکوثر ۱۰۸ کی پہلی آیت میں خُدا نے حضورؐ کو تسلی دی کہ:۔

"(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا (اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ) پس تم اپنے رب ہی کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے (اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَالْاَبْتَرُ)"

یہاں کوثر سے مُراد بے انتہا خیر اور بے شمار نعمتیں ہیں۔

---

(۹) لات و منات :

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

("ضربِ کلیم": "نماز")

حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

("ضربِ کلیم": "تیاتر")

وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خُدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری!

("ضربِ کلیم": "محراب گُل افغان کے افکار" اٹھارہواں بند)

اقبال نے اپنے کلام میں "لات و منات" کی اصطلاح کو "غیر اللہ کی بندگی" اور "گمرہی" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ "ضربِ کلیم" کی مندرجہ بالا نظم "نماز" کے پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ گرچہ انسان اب بوڑھا ہو چکا ہے مگر اُس کے لات و منات ابھی بھی جوان ہے اور یہ لات و منات

ہر زمانے میں اپنا بھیس بدل کر روزِ ازل سے آتے رہتے ہیں، کبھی یہ تراشے ہوئے بُت تراش لیتا ہے۔ الغرض کفر و اسلام کی آویزش روزِ ازل سے چلی آرہی ہے اور باوجود رسولوں کی بعثت کے انسان حق کا منکر رہا۔ اس لئے دوسرے شعر میں وہ مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ تجھے "ایک سجدہ" یعنی ایک خدا کے سامنے سر جھکانا تو گراں گزرتا ہے مگر اپنے بلند مناصب کے حصول کے لئے کتنوں کے دروازوں پر سر بسجود رہتا ہے۔

دوسری نظم "نیا زم" کے شعر میں اقبال یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ تیرے وجود کا انحصار تو تیری خودی پر ہے مگر تو نے اپنے دل کے حرم میں دوسروں کی خودی کو جگہ دے دی ہے یعنی بجائے اُسے خُدا نما بنانے کے اُسے غیروں کی پرستش کا آماجگاہ بنا دیا ہے۔ "معاذاللہ" کہہ کر اقبال اپنے انتہائی تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی اتنی ساری تعلیمات اور رسول مقبولؐ کی اتنی ساری فرمودات کے باوجود بھی گمرہی اِس حد تک پہنچ سکتی ہے؟ اس لئے دوسرے شعر میں اُس سے ملتجی ہیں کہ یک بار تو حرمِ کعبہ سے یہ لات و منات ہٹائے جاچکے ہیں تو کیوں پھر اُسی لات و منات کو اپنے حریمِ وجود میں لا بسایا۔ یعنی کفر کو تو ایک بار مٹایا جاچکا تھا مگر تیرے طرزِ فکر اور طرزِ عمل نے پھر انہیں دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

آخری شعر میں وہ افغانی قبائلیوں کے حال پر افسوس کرتے ہیں کہ باوجودیکہ حرمِ کعبہ ابھی بھی وہی ہے مگر اس کے باوجود جس طرح ظہورِ اسلام کے قبل عرب کے ہر قبیلہ کا بُت جُدا تھا افغانی قبائلیوں نے بھی اپنے اپنے قبیلہ کا بُت الگ الگ بنا رکھا ہے۔ اس لئے وہ دُعا گو ہیں کہ اس سرحدی علاقہ میں ان "لات و منات" کو توڑنے کے لئے کوئی مردِ مومن پیدا ہو جائے۔ اس لئے کہ اس نظم کے اٹھارہویں بند میں اِس شعر کے پہلے کہتے ہیں:۔

عزیز ہے انہیں نام وزیری و محسود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری!
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری!

اقبال نے "لات و منات" کی اصطلاح سورۃ "النجم ۵۳" کے رکوع اکی درجِ ذیل آیات

سے وضع کی ہے :-

"اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اِس لات، اور اس عُزّٰی، اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے (اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی ۝ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی) کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی! دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے اِن کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مُرید بنے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان جو کچھ چاہے اُس کے لئے وہی حق ہے؟ دُنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے"

عربوں کے بتوں کی دو خاصیتیں تھیں۔ ایک کا تعلق ملائکہ اور ارواح یعنی غیر محسوس طاقتوں سے نسبت رکھنے والے، اور دوسرے وہ جو بہت ہی مشہور اشخاص تھے اور اپنے عمدہ کارناموں کی وجہکر مشہور تھے۔ اُن بتوں میں، جو اپنے عمدہ کارناموں کی وجہکر پرستش کئے جانے لگے تھے وہ یہ تھے :-

(۱) ہبل (۲) سواع (۳) یغوث (۴) یعوق (۵) ود (۶) نسر (۷) عُزّٰی (۸) لات (۹) منات (۱۰) دوار (۱۱) اساف، یہ کوہِ صفا پر تھا (۱۲) نائلہ۔ یہ کوہِ مروہ پر تھا (۱۳) عبعب، جس پر اونٹوں کی قربانی کی جاتی تھی (۱۴) کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر تھی اور اُن کے ہاتھ میں استخارہ کے تیر تھے جسے ازلام کہتے تھے اور ایک بھیڑ کا بچہ اُن کے قریب کھڑا تھا اور وہاں پر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی مورت رہتی تھی (۱۵) حضرت مریم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویریں اور مورتیں بھی خانۂ کعبہ میں تھیں۔ اساف اور نائلہ پر قربانیاں کی جاتی تھیں لات و منات کی پرستش سبھی کرتے تھے اور باقی کے خاص خاص قبائل۔ منات مرد بُت تھا اور اُس کا مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قریب

میں تھا۔ زمانۂ حج میں کعبہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہوکر حُجاج منات کی زیارت کرتے تھے۔ عُزّیٰ قریش کی خاص دیوی تھی جو مکّہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ کے مقام پر تھی۔

ان سبھی دیوی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ عزّت لوگوں کے دلوں میں لات اور منات کی تھی۔ اس لئے اُردو شاعری میں انہی دو بتوں کو استعارہ یا تلمیح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اقبال نے بھی انہیں اپنی اصطلاح بنائی۔ اس لئے کہ، جیسا پہلے عرض کیا گیا، باوجود درخشاں ہدایات کے آچکنے کے انسان نے ہر زمانے میں خیالی دیوتاؤں کی پرستش جاری رکھی ہے اس لئے کہ وہ خواہشاتِ نفس کے مرید ہوکر گمرہی کے شکار ہوگئے ہیں۔ وحدہٗ لاشریک سے اُن کی گرویدگی ہمیشہ کم اور خیالی دیوتاؤں سے زیادہ ہی اور رہی ہے۔ اس لئے کہ انہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، انہیں بس دنیا ہی مطلوب ہے۔

اِس اصطلاح سے اقبال در پردہ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ انسان کی گمراہی اس لئے ہے کہ وہ اپنا عقیدہ اور دین بنانے کے لئے علمِ حقیقت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ محض قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر اُس پر اُسی طرح ایمان لے آتے ہیں کہ گویا وہی حقیقت ہے۔ اُن کا دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود ہو جو دنیا میں اُن کے کام تو بناتا رہے اور آخرت اگر پیش آنے والی ہی ہو تو وہاں اُنہیں بخشوانے کا ذمہ بھی لے لے، مگر حلال و حرام کی کوئی پابندی اُن پر نہ لگائے اور اخلاق کے کسی ضابطے میں اُن کو نہ کسے۔ اسی لئے وہ انبیاء کے لائے ہوئے طریقے پر خُدائے واحد کی بندگی کرنے سے مُنحرف رہتے ہیں اور اِن خودساختہ معبودوں کی عبادت ہی اُن کو پسند آتی ہے۔

---

(۱۰) اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ

مُجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!

("ضربِ کلیم": نظم "شکست")

اس شعر میں اقبال نے جاہل صوفیوں کی بے عملی کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بالکل سرد ہو چکا ہے اس لئے کہ انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ "اَلَستُ بِرَبِّکُم" کے معنی بے عمل ہو کر حجرے میں بیٹھ کر صرف خُدا کی یاد کی شراب پیتے رہنا ہے چہ جائیکہ اِس آیت میں اقرارِ عبودیت کی صراحت کی گئی ہے۔ یہ اصطلاح سورۃ "الاعراف" کے رکوع ۲۲ سے لی گئی ہے:-

"اور اے نبیؐ! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود اُن کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اَلَستُ بِرَبِّکُم)"۔ انھوں نے کہا: "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، (قَالُوا بَلٰی) ہم اس پر گواہی دیتے ہیں (شَہِدنَا)۔ یہ ہم نے اِس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ: "ہم تو اِس بات سے بے خبر تھے"، یا یہ نہ کہنے لگو کہ: "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو اُن کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور پر پکڑتے ہیں۔ جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا" دیکھو، اِس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اِس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں"۔

اقبال نے اسی "اقرارِ عبودیت" کو "پیمانِ اوّلین" قرار دیتے ہوئے "بانگِ درا" کی نظم "سرگزشتِ آدم" میں (جو ۱۹۰۵ء کے قبل لکھی گئی) اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ انسان نے دنیا میں آکر اِس پیمانِ اوّلین کو بھلا دیا اور بنی آدم شرک میں مبتلا ہو گئی حالانکہ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں بنائیں گے۔ کہتے ہیں ؎

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

---

(۱۱) لولاک:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

("بالِ جبریل": غزل ۱۰)

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے!
("بالِ جبریل": رُباعی)

جہاں تمام ہے میراث، مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حُجّت ہے نکتۂ لَولَاکَ!
("بالِ جبریل": غزل ۴۶)

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کی مُراد ذاتِ محمّدیؐ ہے۔ اور "صاحبِ لولاک" سے مُراد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبعِ کامل یا غلام اور "لولاکی" سے مُراد ایمان کا رنگ، روشن ضمیری اور روحانیت کی شان ہے۔ یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا تے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ:-

لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ
(اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا)

---

(۱۲) یدُ اللّٰہی:

بے جُرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی!
("ضربِ کلیم": "محرابِ گُل افغان کے افکار" چودھواں بند)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں، کارکُشا، کارساز
("بالِ جبریل" نظم "مسجدِ قرطبہ")

اقبال نے "یدُ اللّٰہی" کی اصطلاح سورۃ "الفتح ۴۸" کی آیت ۱۰ سے لی ہے:-

"اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا (یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ)۔

اب جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اُس کی اپنی ذات پر ہو گا، اور جو اس عہد کی وفا کریگا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔"

اِن آیات میں اشارہ ہے اُس بیعت کی طرف جو مکہ معظمہ میں حضرت عثمانؓ کے شہید ہوجانے کی خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے حدیبیہ کے مقام پر لی تھی۔ یہ بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ حضرت عثمان کی شہادت کا معاملہ اگر صحیح ثابت ہوا تو مسلمان یہیں اور اسی وقت قریش سے نمٹ لیں گے خواہ نتیجہ میں وہ سب کٹ ہی کیوں نہ مریں۔ اسی بیعت کو تاریخ میں "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ذیلقعدہ سنہ ۶ھ کا ہے جب آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ خانۂ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لئے مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے اور مکہ سے کچھ دور پر حدیبیہ کے مقام پر رُک کر حضرت عثمانؓ کو مکہ روانہ فرمایا تھا کہ وہ قریش کو یہ اطمینان دلادیں کہ وہ جنگ کی نیت سے نہیں آئے۔ چونکہ آپؓ کو واپس آنے میں دیر ہوگئی اس لئے افواہ اُڑگئی کہ آپؓ قتل کر دے گئے۔ آخر میں یہ طے پایا کہ اس سال آپؐ واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آئیں۔ اسی کو تاریخ میں "صُلحِ حدیبیہ" کہا جاتا ہے۔

"اللہ کے ہاتھ" کا ذکر جنگِ بدر کے سلسلہ میں سورۃ "الانفال ۸" کی آیت ۱۸ میں اِس طرح وارد ہوا ہے :-

"پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے اُنہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُن کو قتل کیا اور اے نبیؐ، تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اِس کلام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اِس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سُننے اور جاننے والا ہے۔"

بدر کی جنگ رمضان سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی۔ جب آپؐ کو یہ خبر ملی کہ کفارِ مکہ بدر میں آن پہنچے ہیں تو آپ نے تمام مہاجرین اور انصار کو جمع کر کے اُن سے دریافت فرمایا کہ اُن کا مقابلہ

کرنے کے لئے تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر مہاجرین نے بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد انصار نے مہاجرین سے بھی زیادہ جرأت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کا رسولؐ تو کفار کے مقابلہ کے لئے جائے اور ہم گھر دل میں بیٹھے رہیں۔" اسلامی لشکر کی بے سروسامانی کا بہت بُرا حال تھا اور بہت تھوڑا لشکر تھا۔ جب مسلمان اور کفار کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو حضورؐ نے مُٹھی بھر ریت ہاتھ میں لے کر "شاھت الوجوہ" کہتے ہوئے کفار کی طرف پھینکی اور اس کے ساتھ ہی آپ کے اشارے سے مسلمان یکبارگی کفار پر حملہ آور ہوئے۔ اسی واقعہ کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہے کہ: "تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔" اس جنگ میں کفار کو بُری شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس پسِ منظر میں "عشقِ رسولؐ" سے گرویدگی پر اقبال کا درجِ ذیل شعر پڑھئے ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

("بالِ جبریل": ذوق و شوق")

"اللہ کے ہاتھوں" کے الفاظ استعارہ کے طور پر، سورہ "یٰس ۳۶" کی آیت ۷۱ میں اس طرح وارد ہوئے ہیں:۔

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے اِن کے لئے مویشی پیدا کئے ہیں اور اب یہ اُن کے مالک ہیں۔"

(۱۳) کُن فَیَکُون:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون!

("بالِ جبریل"۔ غزل ۲)

صُبحِ ازل جو حُسن ہوا دلستانِ عشق
آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ
("بانگِ درا" : "شمع")

"کُن" کے معنی ہیں "ہوجا" اور "فَیَکُونُ" کے معنی ہیں "وہ ہوجاتا ہے" اقبال نے اس اصطلاح سے خدا کے ماہر خلاق ہونے اور "ہر آن نئی شان" سے اپنی تخلیق میں لگے رہنے کی باتوں کو ذہن نشین کرایا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن حکیم کی اِس آیت سے ماخوذ ہے :۔

"وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کا کام بس یہ ہے کہ اُسے حکم دے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے (اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ)" ــــــ (سورۃ یٰسٓ ۳۶ - آیت ۸۲)

اس پہلے شعر میں اقبال نے اِس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قرآنی زاویۂ نگاہ سے اللہ کائنات کو پیدا کر کے اِس سے بے تعلق نہیں ہو گیا ہے بلکہ اُس کی تخلیق برابر جاری ہے جس کی تائید اِس آیت سے بھی ہوتی ہے :۔

"زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اُسی سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے (کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ)" ــــــ (سورۃ الرحمٰن ۵۵ - آیت ۲۹)

"کُنْ فَیَکُوْنُ" کی اصطلاح قرآن میں بہت سی سورتوں میں وارد ہوئی ہے۔ چند درج ذیل ہیں :۔

"وہ (خُدا) آسمانوں اور زمین کا موجد ہے (بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اِس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہوجا" اور وہ ہوجاتی ہے (وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ)" ــــــ (سورۃ البقرہ ۲ - آیت ۱۱۷)

"وہی ہے زندگی دینے والا، اور وہی موت دینے والا ہے۔ وہ جس بات

کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔
(هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ)۔

—— (سورۃ المؤمن ۴۰- آیت ۶۸)

"اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اُسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا (خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ)"

—— (سورۃ آلِ عمران ۳- آیت ۵۹)

"اور جب فرشتوں نے کہا: "اے مریم، اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہوگا، دُنیا اور آخرت میں معزّز ہوگا، اللہ کے مقرّب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، وہ ایک مرد صالح ہوگا۔" یہ سُن کر مریم بولی: "پروردگار، میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" جواب ملا: "ایسا ہی ہوگا۔" اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے (اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ)"

—— (سورۃ آلِ عمران ۳- رکوع ۵)

---

(۱۴) چوبِ کلیم، یدِ بیضا:

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اِس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم!

("بالِ جبریل"- غزل ۳۹)

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

("بالِ جبریل": غزل ۱)

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا = چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

("بانگِ درا"۔ نظم "سرگزشتِ آدم")

پہلے شعر میں "دانشِ حاضر" سے مُراد یورپی فلسفہ اور سائنس یا حکمتِ غرب ہے جو لادینیت اور مادّیت پر مبنی ہے۔ "سحرِ قدیم" سے مُراد ساحرانِ مصر ہیں جو فرعون کے دربار میں رہتے تھے اور "چوبِ کلیم" سے "عصائے موسیٰؑ" مُراد ہے جس میں ہر قسم کے طلسم اور سحر کو باطل کر دینے کی تاثیر موجود تھی اور جس نے فرعون کے ساحروں تک کو ایمان لانے پر مجبور کیا۔ اس شعر میں ان ساری باتوں کے حوالوں سے اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ موجودہ تعلیم اور طرزِ فکر تو سحرِ قدیم جیسی ہے جو باطل کو حق بنا کر پیش کیا کرتی تھی اس لئے اِس زمانے میں پھر اُسی ایمانی طاقت (یعنی چوبِ کلیم) کی ضرورت ہے جو حق کے خلاف باطل کا مقابلہ کر سکے۔

دوسرے شعر میں "فرعون" اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد "باطل کا داعی" ہے۔ یہاں بھی اقبال یہی کہتے ہیں کہ کفر اور اسلام، باطل اور حق ایک دوسرے سے ہر زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں مگر مجھے اِس کا کوئی غم یا اِس کی کوئی فکر اِس لئے نہیں کہ میرے آستیں میں "یدِ بیضا" ہے یعنی میں حکمتِ کلیمی کا وارث ہوں۔ میرے پاس بھی وہی معجزہ ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو عطا کیا تھا۔ جس کی مدد سے اُنہوں نے فرعون کو شکست دی تھی۔

تیسرے شعر میں بھی اسی نورِ ازل (یعنی "یدِ بیضا") کے زیرِ آستیں چھپانے کی بات ہے۔ "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" اُن نشانیوں میں سے ہیں جو خدا نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے دربار میں دعوتِ حق دینے اور باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے عطا فرمائی تھیں۔ اقبال کی یہ دونوں اصطلاحیں درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہیں:۔

"اور تمہیں (نبیؐ کو) کچھ موسیٰؑ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اُس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ: ذرا ٹھیرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اِس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے"۔

"وہاں پہنچا تو پکارا گیا: "اے موسیٰؑ! میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں اتار دے۔ تو وادیٔ مقدس طویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے، سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اُس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔ پس کوئی ایسا شخص جو اُس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اُس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے، اور نہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا" ـــ اور اے موسیٰؑ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں"۔ فرمایا: "پھینک دے اس کو موسیٰؑ" اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھا جو دوڑ رہا تھا۔ فرمایا: "پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے" ـــــ

ـــــ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱)

اقبالؔ جب اِن آیات سے "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" کی اصطلاحیں وضع کرتے ہیں تو وہ یہ بات بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ اِن سے باطل کا مقابلہ اُسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ "ایمان" ہو جس کی تلقین خدائے تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو مندرجہ بالا آیات میں اِن نشانیوں کو عطا کرنے کے قبل وحی کے ذریعے کی تھی اور موجودہ اُمّتِ مسلمہ کے لئے تو یہ وحی قرآن کی شکل میں موجود ہے صرف ہاتھ میں لاٹھی اور آستین میں ہاتھ چھپانے سے تو وہ "ضربِ کلیمی" نہیں لگ سکتی جو حضرت موسیٰؑ نے لگائی تھی۔

فرعون کے دیار میں "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" کے کرشموں کے متعلق ارشاد ہے :۔

"(پھر اُن قوموں کے بعد جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر اُنہوں نے

بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ موسیٰؑ نے کہا: "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔" فرعون نے کہا: "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو اُسے پیش کر۔" موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔ اِس پر فرعون کے قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ: "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، اب کہو کیا کہتے ہو؟" پھر اِن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اِس کے بھائی کو انتظار میں رکھئے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہرِ فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔ اُنہوں نے کہا: اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اِس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟" فرعون نے جواب دیا: "ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔" پھر اُنہوں نے موسیٰؑ سے کہا: "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟" موسیٰؑ نے جواب دیا: "تم ہی پھینکو۔" اُنہوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔ ہم نے موسیٰؑ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اُس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ اُن کے اس جھوٹے طلسم کو نگل گیا۔ اِس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ اُنہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا (فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کی بجائے) اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: "ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ (حضرت موسیٰؑ کے حقیقی بھائی) مانتے ہیں"۔ —— (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۳ اور ۱۴)

"چوبِ کلیم" کے معجزات پر سورۃ "الشعرآء ۲۶ کے رکوع ۴ میں اسی قرآنی قصہ پر آگے فرمایا گیا ہے:۔

"ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ تمہارا پیچھا کیا جائے گا"۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لئے) شہروں میں نقیب بھیج دئے (اور کہلا بھیجا) کہ: "یہ کچھ مُٹھی بھر لوگ ہیں، اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے، اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے"۔...... صبح ہوتے یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰؑ کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ: "ہم پکڑے گئے"۔ موسیٰؑ نے کہا: "ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا"۔ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ "مارا اپنا عصا سمندر پر۔ (فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ)"۔ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اُسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰؑ اور اُن سب لوگوں کو جو اُس کے ساتھ تھے، ہم نے بچا لیا، اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ اِس واقعہ میں ایک نشانی ہے، مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

"چوبِ کلیم" کے معجزہ پر سورۃ البقرہ ۲ کے رکوع ۷ میں ایک واقعہ اس طرح بھی وارد ہوا ہے:۔

"یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) کے لئے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ "فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ)"۔ چنانچہ

اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اُس کے پانی لینے کی ہے۔"

"یدِ بیضا" کی اصطلاح سے مضمون آفرینی کی ایک دلکش مثال "بانگِ درا" کی نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") کے درجِ ذیل شعر میں دیکھیے جو اقبال جیسے قادر الکلام شاعر ہی سے ممکن ہو سکتا ہے ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظُلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر

حضرت بلالؓ حبشی سیاہ فام تھے مگر اقبال عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کا یہ نکتہ اس شعر میں پیش کرتے ہیں کہ اِس عشق کی بدولت حضرت بلالؓ کی شخصیت اس قدر دلکش ہو گئی کہ اگرچہ وہ سیاہ فام تھے لیکن مومنوں کی نظر میں اُن رضؓ کی سیاہ رنگت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ سفید معلوم ہوتی تھی۔ پہلے مصرعہ سے "عشقِ رسولؐ" مُراد ہے۔

---

(۱۵) لن ترانی:

صدائے لَن تَرانی سُن کے اے اقبال میں چُپ ہوں
تقاضا کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے ماروں میں

("بانگِ درا": غزلیات حصہ دوئم)

کُھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیثِ لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

("بالِ جبریل": رُباعی بعد از نظم: "ہسپانیہ")

"لن ترانی" کی اصطلاح درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہے:۔

"ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب و روز کے لئے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد

میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔ موسیٰؑ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ: "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا"۔ جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اُس کے رب نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے التجا کی کہ: "اے میرے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں (قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ)" فرمایا، "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا (قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ)، ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا"۔ چنانچہ اُس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں"۔ فرمایا: "اے موسیٰؑ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا"۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷)

---

(۱۶) براہیمی نظر:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

("بانگِ درا": نظم "طلوعِ اسلام")

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

("بانگِ درا": نظم "خضرِ راہ۔ صحرا نوردی")

اقبالؔ نے "براہیمی نظر" سے مُراد دل کی بصیرت لی ہے اور اسے "چشمِ جہاں بین خلیلؑ" سے بھی موسوم کیا ہے۔ اسی نظر کے عطا کیے جانے کی دُعا مانگنے کی تاکید اُنہوں نے درج ذیل شعر میں کی ہے۔ کیونکہ دیکھنے کو تو ظاہری آنکھوں سے خُدا کی نشانیوں کو سب دیکھتے ہیں مگر پھر بھی اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے یہی "براہیمی نظر" - دلِ بینا بھی ہے ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

("بالِ جبریل": غزل ۲۰)

اقبالؔ نے یہ اصطلاح درج ذیل آیات سے لی ہے جو "دلِ بینا" کی بہترین مثال ہے:-

"ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا: "کیا تو بتوں کو خُدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں" ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا انتظامِ سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اُس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھا: "اے برادرانِ قوم، میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خُدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" —— (سورۃ الانعام ۶ - رکوع ۹)

اقبالؔ نے اسی "براہیمی نظر" کو "نگاہِ شوق" کا بھی نام دیا ہے اور "ضربِ کلیم" میں اسی نام کی نظم میں اس "نگاہِ شوق" کے مُضمرات اور معجزات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے صرف دو اشعار درجِ ذیل ہیں:-

نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی ! | کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو | ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی !

---

(۱۷) اُمّ الکتاب :

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب !

("ضربِ کلیم"؛ "علم و عشق")

اس بند میں اقبالؔ نے عشق کا سرچشمہ "اُمّ الکتاب" کو بتایا جب کہ علم کا سرچشمہ وہ دُنیوی کتابیں ہیں جن سے انسان ادراک حاصل کرتا ہے۔ عشق کا فلسفہ، روزِ ازل سے، ایک ایسی کتاب میں ہے جو سب کتابوں کی ماں ہے۔ اقبالؔ نے "اُمّ الکتاب" کی اصلاح میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :-

"حٰمٓ ۔ قسم ہے اُس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو۔ اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے (وَاِنَّهٗ فِىْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ)، ہمارے یہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب۔ اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمہارے یہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لئے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟" —— (سورۃ الزخرف ۴۳۔ رکوع ۱)

اس "اُمّ الکتاب" کو سورۃ "الواقعہ ۵۶" کے رکوع ۳ کی درج ذیل آیات میں "(کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ) بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا گیا :-

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔ کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت (فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ)۔ جسے مُطہّرین کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل

کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو، اور اِس نعمت میں اپنا
حصّہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اِسے جھٹلاتے ہو؟"۔

قرآن مجید میں "اُمُّ الکتاب" کو "الکِتٰب" بھی کہا گیا ہے:۔

"پھر اے نبیؐ، ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) بھیجی جو حق لے کر آئی ہے
اور الکِتَاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے
والی اور اُس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا، تم خدا کے نازل کردہ
قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا
اُس سے مُنہ موڑ کر ان کے خواہشات کی پیروی نہ کرو"۔ (سورۃ المآئِدۃ ۵۔
رکوع ۷)

سورۃ "البرُوج ۸۵" کے رکوع ۱ میں فرمایا گیا کہ:

"یہ قرآن بلند پایہ ہے (بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ) اُس لوح میں (نقش ہے)
جو محفوظ ہے (فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ)"۔

---

(۱۸) عَلَّمَ الاَسْمَاءَ

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ!
("ضربِ کلیم"، "ذکر و فکر")

اِس نظم میں اقبالؔ نے "ذکر" اور "فکر" پر قرآنی آیات کی طرف اشارہ کیا ہے جو دراصل ایک سالک یا مومن کے لیے روحانی ترقی کی منزلیں ہیں اور جن کی شان میں عَلَّمَ الاَسْمَاءَ کی آیت نازل ہوئی۔ پہلے "ذکر" اور "فکر" پر قرآنی آیات ذہن نشین کرلی جائے تاکہ زیر تجزیہ شعر گرفت میں آسکے:۔

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں
اُن ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر
حال میں خُدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے

ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اُسے در حقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا"۔ ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع۔ ۲)

انہی آیات کی ہو بہو ترجمانی اقبالؔ نے انہی معنوں میں درج ذیل اشعار میں کی ہے:۔

تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر
تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود!

("ضربِ کلیم": "اہلِ ہُنر سے")

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

("ضربِ کلیم": "مدنیتِ اسلام")

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خُدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سُرعت میں بجلی سے زیادہ تیز!

("بالِ جبریل": غزل ۲)

مقامِ ذکر کمالاتِ رومیؔ و عطّارؔ
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا!
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلےٰ!

("ضربِ کلیم": ذکر و فکر")

اب "عَلَّمَ الاَسمَاءَ" کی اصطلاح پر غور کریں جو ان ہی ذکر و فکر کرنے والوں کی شان میں نازل ہوئی

ہے:

"پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا: "میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے"۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا)، پھر اُنہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: "اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا)، تو ذرا اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ اُنہوں نے عرض کیا: "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہمکو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا، "تم اِنہیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ"۔ جب اُس نے اُن کو اِن سب کے نام بتا دیے، تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اُسے بھی میں جانتا ہوں"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۴)

---

(۱۹) لَا یَحْزَنُوْنَ:

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا، مجھے صاحب جنوں کر!

("بالِ جبریل"۔ رباعی بعد از غزل)

"لَا یَحْزَنُوْنَ" پر قرآن میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں اور اقبالؔ نے یہ اصطلاح انھی آیات سے وضع کی ہے۔ سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۶۲ میں فرمایا گیا ہے:۔

"یقین جانو کہ نبی عربی کے ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر میں ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا۔ اُس کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور اُس کے لئے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے (وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ)"۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" کی آیت سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۷، سورۃ المآئِدۃ ۵۔ رکوع ۱۰، سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۵، سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۴، سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۷، سورۃ الاحقاف ۴۶۔ رکوع ۲۔ سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۴، سورۃ الزُخرُف ۴۳۔ رکوع ۷، سورۃ الزمر ۳۹، رکوع ۶ اور سورۃ حٰمٓ السجدہ ۴۱۔ رکوع ۴ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

---

(۲۰) قلبِ سلیم:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم

("ضربِ کلیم": فقر و ملوکیت")

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریّا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

("بانگ درا": جوابِ شکوہ")

نوٹ: "قلبِ سلیم" کی اصطلاح پر تفصیلی روشنی، قرآن کی رو سے، اِسی مجموعے کے مضمون: "نظم "جوابِ شکوہ" (قرآن کی روشنی میں)" کے اکیسویں بند میں ڈالی گئی ہے۔

اقبالؔ کے چند اشعار قرآن کی روشنی میں

ویسے تو اقبالؔ کا سارا کلام ہی قرآن کی تعبیر اور تفسیر ہے مگر ذیل میں چند اشعار ہی پیش ہیں جن میں قرآنی تصورات یا ایمان کا کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور موجود ہے۔

(۱)

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

("بانگِ درا: "خضرِ راہ: دنیائے اسلام")

نظم "خضرِ راہ" کی یہ ذیلی نظم "دُنیائے اسلام" پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے خاتمہ پر مغربی سامراجیوں کے ذریعے پوری سلطنتِ عثمانیہ پر اُن کے غاصبانہ قبضے کے ردِّ عمل کا اظہار "بانگِ درا" میں بعد کی نظم "طلوعِ اسلام" میں بھی ہے جب مصطفےٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۲ء میں یونانیوں سے جنگ کر کے کسی صورت موجودہ تُرکی کو پھر سے واپس لے لیا۔ اِس جنگِ عظیم کے نتیجہ کے طور پر دُنیائے اسلام کا نقشہ اِسی ذیلی نظم کے درج ذیل شعر میں اس طرح اقبالؔ نے پیش کیا ہے ؎

حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اس سراسیمگی پر عالمِ اسلام میں خلجان بپا تھا۔ مغربی سامراجیوں سے رحم کی درخواستیں کی جا رہی تھیں کیونکہ لڑنے کی آزمائش جنگِ عظیم میں ہو چکی تھی۔ اقبالؔ نے طنزاً دُنیائے اسلام سے کہا کہ تو اپنی مصیبتوں کی دوا (مومیائی) کے لئے غیروں سے بھیک مانگتا پھرتا ہے جب کہ اِن کا علاج تیرے پاس موجود ہے۔ اس گدائی سے تو بہتر ہے کہ تو اپنی شکست کا اعتراف کر کے مُنہ لپیٹ کر سو جائے۔ مگر اِس شعر کے دوسرے مصرعہ

میں اقبالؔ اُن میں اولوالعزمی پیدا کرنے کے لئے اُسے کہتے ہیں کہ تو "مورِ بے پر" یعنی حقیر چیونٹی ضرور ہوگیا ہے مگر تو کسی بادشاہ یا حکمراں سے رحم کی درخواست نہ کر جس طرح چیونٹیوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کی تھی۔ بلکہ اِسی ذیل نظم میں آگے چل کر وہ یہ دوا بتاتے ہیں کہ ؎

تا خلافت کی بنا دُنیا میں پھر ہو اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اقبالؔ نے نظم "شکوہ" (دیکھیں ضمیمہ نمبر ۲) کے ستائیسواں بند میں بھی مسلمانوں کو "مورِ بے مایہ" کہا ہے اور دُعا کی ہے کہ: "مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے"۔

اقبالؔ کا زیرِ تجزیہ شعر سورۃ "النمل ۲۷" کے رکوع ۲ کی درج ذیل آیات سے ماخوذ ہے:-

"ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور اُنھوں نے کہا کہ: "شکر ہے" اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اور داؤد کا وارث سلیمانؑ ہوا۔ اور اُس نے کہا: "لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں، بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔" سلیمان کے لئے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ اُن کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: "اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور اُنھیں خبر بھی نہ ہو۔" سلیمانؑ اُس کی بات پر مُسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا:-

"اے میرے رب، مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں

میں داخل کر۔"

مندرجہ بالا آیات میں وراثت اور لشکر کا ذکر بھی وارد ہوا ہے۔ اس لئے کہ خدا نے حضرت سلیمانؑ کو ایک سلطنت بخشی تھی جسے مختصر اس طرح سمجھا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کئی ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے مگر آخر کار اُن کو ایک فرماں روا کے تحت اپنی ایک نئی سلطنت قائم کرنی پڑی (دیکھیں سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳۲ اور سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ رکوع ۱، آیت ۵)۔ اِس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے (۱) طالوت ۱۰۲۰ ق۔م تا ۱۰۰۴ ق۔م (۲) حضرت داؤد علیہ السلام ۱۰۰۴ ق۔م تا ۹۶۵ ق۔م اور (۳) حضرت سلیمان علیہ السلام ۹۶۵ ق۔م تا ۹۲۶ ق۔م)۔ ان فرمانرواؤں نے وہ کام مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

(۲)

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی! ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

("بانگِ درا" غزلیات حصہ اول)

یہ شعر جو ۱۹۰۵ء کے قبل کہا گیا شوخی کا شائبہ لئے ہوئے ہے۔ خدا سے شوخی اور چھیڑ چھاڑ تو اُردو شعراء کا وطیرہ رہا ہے اور شاید اقبال اُردو شعراء میں سرِفہرست ہوں گے جس کا ثبوت "بانگ درا" میں اُن کی نظم "شکوہ" اور "بالِ جبریل" میں شروع کی غزلیات ہیں۔ مگر اِن کی تہ میں قُربِ الٰہی اور عشق رسولؐ میں گرویدگی میں بھی اُن کا شاید کوئی ثانی نہ ہو۔ ایسا ہی ایک شعر یہ ہے جو درج ذیل آیت کی تلمیح ہے:-

"ہم نے اِس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اِس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے (اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا)"
—— (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۷۲)

امانت سے مُراد ہے اُن ذمہ داریوں کا بار جو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین میں اختیارات

اور عقل دے کر انسان پر اُسے "خلیفۃ الارض" کے منصبِ جلیلہ پر فائز کر کے ڈالی ہیں۔ اور پھر یہ کہ اس بارِ امانت کا حامل ہو کر بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا اور خیانت کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

اقبالؔ تعجب کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ ہم خُدا کے احکام کو مانتے ہیں اور اپنے دل کو بُری باتوں سے روک کر دل پر سختیاں تک کرتے ہیں تو ہم ظالم ٹھہرا دیئے گئے اور جب ماسوا اللہ کے کسی غیر سے لَو نہیں لگاتے تو ہم جاہل کہلائے جانے لگے۔" ہائے کیا اچھی کہی! "میں غضب کی شوخیٔ رندانہ ہے۔

قرآن میں ایسے تو "ظالم" کی صراحت بالتفصیل بہت جگہوں میں آئی ہے۔ مگر ہر جگہ اس سے مُراد "حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنا" ہی ہے۔ سورۃ "العنکبوت ۲۹" کی آیت ۶۸ میں فرمایا گیا ہے:-

"اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اُس کے سامنے آچکا ہو؟ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم نہیں ہے؟"

قرآن میں "جاہل" سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قرآن کا علم نہیں رکھتا خواہ اُس نے کتنا ہی دنیوی علم حاصل کر لیا ہو۔

"سورۃ الاحزاب ۳۳" کی متذکرہ بالا آیت ۷۲ میں جس امانت کا بار انسان کے اُٹھا لینے کی بات کہی گئی ہے اُس کی ترجمانی اقبالؔ نے درجِ ذیل شعر میں کی ہے ؎

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اُٹھا اسکو اُٹھایا تو نے

("بانگِ درا" : نظم "انسان اور بزمِ قدرت")

یہ نظم "خورشید درخشاں" اور انسان کے مابین مکالمہ کے طور پر ہے جس میں غیب سے انسان کو یہ آواز آئی جو اس شعر میں ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ اقبالؔ انسان کو اس شعر میں اسی بارِ امانت کے فریضے کو انجام دینے کی طرف ذہن مبذول کراتے ہیں جسے انجام دینے

پر خدا اُسے ظالم اور جاہل کہتا ہے۔

(۳)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

("بالِ جبریل": لینن (خدا کے حضور میں)")

اس شعر کا پہلا مصرعہ درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے (وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ) اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم کو سوجھتا نہیں (وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ)" ——— (سورۃ الذّٰریٰت ۱۵- رکوع ۱)

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "زندہ" میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے:

" اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے (اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ)" ——— (سورۃ البقر ۲- رکوع ۳۴)

" اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے (اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ)" ——— (سورۃ اٰلِ عمران ۳- آیت ۲)

یہ پورا دوسرا مصرعہ ترجمان ہے درجِ ذیل آیت کا :۔

" اے نبیؐ، اُس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں (وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ)۔ اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُس کا باخبر ہونا کافی ہے۔" ———
(سورۃ الفرقان ۲۵- آیت ۵۸)

" ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے"۔ ——— (سورۃ القصص ۲۸- رکوع ۹)

---

(۴)

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قُل ھُوَ اللہُ کی شمشیر سے خالی ہے نیام!

("ضربِ کلیم": "توحید")

اقبالؔ اِس شعر میں مُسلم رہنماؤں، مُلّاؤں، خانقاہوں کے پیروں، مسجدوں کے اماموں، مکتبوں کے مُدرّسوں یعنی ہر وہ شخص جو "میرِ سپہ" بنا بیٹھا ہے سے مخاطب ہوکر اُن پر یہ طنز کرتے ہیں کہ تم "میرِ سپہ" (یعنی سپہ سالار) بن کر حق و باطل کی جنگ تو لڑنے چلے ہو مگر تمہارے آلاتِ حرب میں وہ شمشیر نہیں جس پر "قُل ھُوَ اللہ" لکھا ہو یعنی تمہارا سارا بھروسہ فتح و نصرت کے لئے تو اللہ پر ہونا چاہئے تھا نہ کہ صرف ہتھیار پر۔ جہاد فی سبیلِ اللہ میں تو ایمان یہ ہونا چاہئے (جو تُم میں نہیں) کہ:۔

"میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیّت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے" ـــــ (سورۃ الانعام ۶- آیت ۱۶۲)

"سورۃُ الاِخلاص ۱۱۲" کی آیت "قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ" اُس وقت نازل ہوئی جب مُنکرین اور مُشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بار بار یہ سوال کرتے تھے کہ:۔ "تمہارا رب ہے کیا؟ ذرا اُس کی شکل صورت بناؤ تو بات کچھ سمجھ میں آئے"۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عرب کے منکر اور مُشرک "اِلٰہ" کے ساتھ "اَللہُ" کو مانتے ضرور تھے مگر اُن کے یہاں اِن دونوں کا تصوّر الگ الگ معنوں میں تھا۔ وہ یہ مانتے تھے کہ اِس کائنات کا موجد اور خالق "اَللہُ" ہے نہ کہ "اِلٰہ" جس کے سینکڑوں بُت بنا کر وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ اِس لئے ایمان لانے والوں کے لئے کہا گیا کہ: "لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ" پر ایمان لاؤ نہ کہ دونوں پر الگ الگ معنوں میں۔

مُنکرین و مشرکین چونکہ لفظ "اَللہُ" سے بخوبی واقف تھے اِس لئے اُن کے بار بار اس سوال پر کہ: تمہارا رب ہے کیا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہدایت فرمائی گئی کہ

قُلْ هُوَ اللّٰہُ (کہو وہ اللہ ہے)

یعنی تمہارا "اِلٰہ" نہیں۔ لفظ "قُلْ (کہو)" اِس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب وہ بار بار یہی سوال کرتے ہیں تو اُن سے کہو کہ وہ "اَللّٰہ" ہے یعنی وہی جسے تم خود "اَللّٰہ" مانتے ہو۔ مگر "اِلٰہ" کی تردید میں اِس کے بعد ہی "سورۃ الاخلاص ۱۱۲" کی اِس پہلی آیت میں "اَحَدٌ" (یکتا) کا اضافہ کر دیا گیا یعنی وہ اپنے صفات میں یکتا اور اکیلا ہے تاکہ پھر وہ "اللّٰہ" کے ساتھ "اِلٰہ" کی بات نہ لائیں اُس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

اقبالؔ نے زیرِ تجزیہ شعر میں اِس آیت کے اِنہی اہم نکتوں کو ذہن نشین کرانے کے لئے طنز کیا ہے کہ "قُلْ هُوَ اللّٰہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام"۔ یہ شمشیر جب نیام میں آجاتی ہے یعنی جب یہ کلمۂ طیبہ دل میں گھر کر لیتا ہے تو ایک سپاہی یا میرِ سپہ میں، حق و باطل کے کار زار میں، کیا سرور پیدا کرتی ہے ایک حدیث میں اس طرح مروی ہے کہ فرمایا حضرت عائشہ رضؓ نے کہ:۔

"ایک شخص کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مُہم کا میرِ سپہ بنا کر بھیجا مگر وہ پورے سفر میں نماز کی قرأت قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پر ختم کرتے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ: "اُن ہی سے پوچھو"۔ جب اُن سے پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ: "میں ایسا اِس لئے کرتا ہوں چونکہ اس میں خُدائے ذوالجلال کی صفات مُضمر ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سُنی تو لوگوں سے فرمایا: "اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالےٰ اُنہیں محبوب رکھتا ہے"۔"

حق و باطل کی جنگ میں ایمان کے اسی نکتہ کو اقبالؔ نے اِس طرح بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ ؎

مردِ سپاہی ہے وہ اُس کی زرہ لَا اِلٰہ
سایۂ شمشیر میں اُس کی پنہ لَا اِلٰہ

("بالِ جبریل": نظم "مسجدِ قرطبہ")

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

("بالِ جبریل": غزل ۱۲)

---

(۵)

جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

("بانگِ درا": "طلوعِ اسلام")

اس شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کو "خیرِ اُمت" ہونے کی وجہ کر اُس کا یہ رُتبہ ذہن نشین کرا رہے ہیں کہ تم ایسی اُمت یعنی اُمّتِ محمدیؐ سے تعلق رکھتے ہو کہ روزِ حشر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو اِس "جہانِ آب و گِل" سے اُٹھا کر تمھاری شفاعت کے لئے تمہیں ساتھ لے جائیں گے اور تمہیں ارمغان (یعنی تحفہ) کے طور پر پیش کر کے "عالمِ جاوید" یعنی جنّت میں پہنچا دیں گے۔ وہ خدا کے حضور یہ "ارمغاں" یہ کہتے ہوئے پیش کریں گے کہ تو نے جتنی اُمتیں پیدا کیں اُن میں یہ "اُمّتِ محمدی" والے ہماری اُمّت سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے خدائی احکام کو سچ مانا اور میری پیروی کی۔ اب یہ تیرے سامنے حاضر ہیں اور چونکہ تیرا وعدہ ہے کہ تو اُن مخلص بندوں کو جنہوں نے ایمان لا کر نیک اعمال کئے جنّت کا اجر عطا فرمائے گا اس لئے انہیں عالمِ جاوید میں جگہ دے۔

اقبالؔ کا یہ شعر اِس حدیث سے ماخوذ ہے:-

"میں تمہاری وجہ سے (قیامت کے دن) دوسری اُمتوں پر فخر کروں گا"

یعنی "اُمّتِ محمدیؐ" ہونے کی وجہ کر قیامت میں مسلمانوں کو دنیا کے سارے انسانوں

پر کیا فضیلت حاصل ہو گی اس پر بھی خُدا کا وعدہ ہے کہ :-

"یہ وہ دن ہو گا (روزِ حشر) جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لئے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (سورۃ التحریم ۶۶ - رکوع ۲)

اِسی وعدہ پر اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم "ترانۂ ملّی" میں ملّتِ اسلامیہ کے اِس اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اِس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

---

(۶)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

("بالِ جبریل": غزل ۶۰)

امام فخر الدین رازی چھٹی صدی ہجری میں بہت مشہور فلسفی گزرے ہیں۔ اُن کی مشہور تصنیف "مفتاح الغیب" ہے۔ مگر اقبالؔ اُن کے معتقدوں میں نہ تھے۔ اُن کے مُرشد رومیؒ ہیں۔ اِس لئے "بالِ جبریل" کی غزل ۵۲ میں کہتے ہیں ؎

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومیؔ، ہارا ہے رازیؔ!

"کشّاف" اُس کتاب کا نام ہے جو چھٹی صدی ہجری میں ابوالقاسم محمود الزمخشری نے تفسیر کے طور پر لکھی۔ یہ اپنے وقت کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ صاحبِ "کشّاف" نے ۵۳۸ھ میں وفات پائی۔

زیرِ تجزیہ شعر کا تعلق اُس واقعہ سے ہے جو اقبالؔ کے سوانح نگاروں نے بتائی ہے۔ وہ یہ کہ اقبالؔ بچپن میں روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اُن کے والد روزانہ اُن سے تلاوت کرتے وقت یہ سوال کرتے: "تم کیا پڑھ رہے ہو؟" اقبالؔ روزانہ یہی جواب دیتے کہ: "قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں" ایک روز یہ سوال کیے جاتے پر اقبالؔ نے اپنے والد سے دریافت فرمایا کہ جب آپ روزانہ ہمیں قرآن مجید کی تلاوت کرتے دیکھتے ہیں تو پھر یہ کیوں پوچھتے ہیں کہ: "تم کیا پڑھ رہے ہو؟" اُن کے والد نے جواب دیا کہ: "قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت تم جب تک یہ نہ سمجھو کہ یہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اُسی طرح نازل کیا جا رہا ہے جس طرح حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا تھا تلاوت کا لطف نہیں آئے گا"

اِس شعر کا پہلا مصرعہ درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہے:۔

"اے نبیؐ، ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح اور توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے۔ اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں (و لعلھم یتفکرون)"

—— (سورۃ النحل ۱۶ ـ رکوع ۶)

اس آیت سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی قرآن مجید کے مطلب کو لوگوں پر واضح کر دینا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس سے وہی لوگ مُستفید ہو سکتے ہیں جو اِس کتاب کی تلاوت کے وقت یہ محسوس کریں کہ یہ کلامِ پاک اُن پر نازل ہوا ہے۔ اِس شعر میں "نزول" سے مُراد دل میں اُترنا اور اُن پر غور و فکر کرنا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ کوئی تفسیر "گرہ کُشا" نہیں ہو سکتی اور نہ رازی ہی کے فلسفے تیرے ضمیر میں بصیرت کی روشنیاں پیدا کر سکتے ہیں۔

(۷)

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

("ضربِ کلیم" : "عورت کی حفاظت")

یہ نظم کل تین ہی اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ دوسرا شعر ہے۔ اِس شعر میں اقبال یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ "نسوانیتِ زن" کی حفاظت نہ تو پردے سے ہو سکتی ہے اور نہ تعلیم قدیم ہو یا تعلیم جدید سے بلکہ اُس کی "نسوانیت" صرف مرد ہی کی نگہبانی سے ہو سکتی ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرعہ درج ذیل آیت کا ترجمان ہے :-

"مرد عورتوں پر قوام ہیں (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ)، اِس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں (فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ) اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں" —— (سورۃ النسآء ۴۔ رکوع ۶)

"قوّام" اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو دُرست حالت میں چلانے اور اُس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اُس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ اسی لئے اقبال نے لفظ نگہبان استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید کے بعض ترجموں میں "قَوّٰمُوْنَ" کا ترجمہ "حاکم" کیا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ قرآن میں کہیں بھی مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم نہیں کہا گیا ہے۔ "فضیلت" سے مُراد عزت کا درجہ نہیں بلکہ جسمانی ساخت، طاقت، بہادری، نڈرپن وغیرہ جیسی طاقتیں ہیں جو عورتوں میں فطری طور پر نہیں۔ اس لئے ایک ایسی صِنف کو جو فطری طور پر کمزور ہو اُس کا کوئی نگہبان ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اقبال نے اِس نظم کا نام "عورت کی حفاظت" رکھا ہے نہ کہ "عورت کا درجہ"

اقبال نے اس نکتہ کو کہ "مرد عورتوں پر قوام ہیں" ایک "زندہ حقیقت قرار دیا ہے اور اِس نظم کے تیسرے اور آخری شعر میں مُتنبّہ کیا ہے کہ ؎

جس قوم نے اِس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

---

(۸)

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر اِن کو
تپش آمادہ تر از خونِ زُلیخا کر دیں

("بانگِ درا": "عبدالقادر کے نام")

اقبالؔ نے یہ نظم "عبدالقادر کے نام" ۱۹۰۸ء کے آغاز میں اپنے محسن، دوست اور کرمفرما سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ۔ لا کے نام لکھی تھی جو ۱۹۰۷ء میں اقبالؔ کے ساتھ انگلستان ہی میں مقیم تھے۔ اقبالؔ نے اعلیٰ تعلیم یورپ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک حاصل کی تھی۔ عبدالقادر مشہور زمانہ اُردو کا ادبی ماہنامہ "مخزن" کے مُدیر بھی تھے۔ اقبالؔ نے نہ تو کبھی کسی مُشاعرہ میں شرکت کی اور نہ کسی رسالہ کو اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجا۔ مگر اُن کے یہ محسن اُن کا خاص خاص کلام کبھی کبھار اِن سے لے کر "مخزن" میں شائع کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اقبالؔ کا پہلا مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اِن کی وفات ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہی میں ہوئی۔

اِس نظم میں اقبالؔ اپنے اِس دوست سے مخاطب ہو کر اُن سے کہہ رہے ہیں کہ آؤ ہم اور تم مسلمانوں کو اونچا اٹھانے کی مل کر کوشش کریں چنانچہ کہتے ہیں ؎

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

اور اس کے بعد ہی زیرِ تجزیہ شعر آتا ہے جس میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم دونوں مل کر مسلمانوں کو "یوسفِ گم گشتہ" یعنی مسلمانوں کی دیرینہ عظمت کی یاد دلا کر اُن میں اس عظمت کی بازیابی کے لیے (جسے وہ گم کر چکے ہیں) اُن کے خون کو اُس سے بھی زیادہ "تپش آمادہ" یعنی بیقرار کر دیں جتنی کہ عزیزِ مصر کی بیوی زُلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے بھی نہیں رہی ہوگی۔ "جلوۂ یوسفِ گم گشتہ" سے مُراد بزرگوں کے کارنامے اور "تپش آمادہ تر" سے مُراد اِن بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی

آرزو ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام اور زُلیخا کا قصہ بالتفصیل سورۃ "یوسف ۱۲" میں بیان فرمایا گیا ہے۔ زُلیخا آپ پر اتنی فریفتہ تھی کہ جب اُس کے عشق کی باتیں عام ہونے لگیں اور عورتیں زُلیخا پر آوازے کسنے لگیں تو زُلیخا نے اُن عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کا حُسن دیکھنے کے لئے بُلا وا بھیجا تاکہ وہ خود قائل ہو جائیں کہ ایسے انسان کے عشق میں کسی بھی عورت کا خون "تپش آمادہ" ہو سکتا ہے اور اقبالؔ نے اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اس واقعہ کی تلمیح کی ہے:۔

"شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ: "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام (حضرت یوسف علیہ السلام) کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ محبت نے اُس کو بے قابو کر رکھا ہے۔ ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔" اُس (زُلیخا) نے جو اُن کی مکارانہ باتیں باتیں سُنیں تو اُن کو بُلا وا بھیج دیا اور اُن کے لئے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چُھری رکھ دی۔ (پھر عین اُس وقت جب کہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اُس نے یوسفؑ کو اشارہ کیا کہ اُن کے سامنے نکل آ۔ جب اُن عورتوں کی نگاہ اُس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اُٹھیں: حَاشَ لِلّٰہِ یہ شخص انسان نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔" عزیز کی بیوی نے کہا: "دیکھ لیا، یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اِسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل وخوار ہوگا۔" —— (سورۃ یوسف ۱۲۔ رکوع ۴)

غالبؔ نے اِسی واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

---

(۹)

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

زندگی اقوام کی بھی ہے یوں ہی بے اعتبار
رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے اِن کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملّت گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اِس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار
ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

("بانگِ درا": "گورستانِ شاہی")

یہ نظم "گورستانِ شاہی" "مخزن" میں جون ۱۹۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اِس نظم کی تمہید میں اقبالؔ نے لکھا تھا کہ :-

"حیدر آباد (دکن) کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما، جناب نذیر حیدری، معتمد محکمۂ فنانس، مجھے ایک شب اُن شاندار، مگر حسرت ناک، گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے۔ جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی نے بادلوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی اُس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔"

اِس نظم میں جو کافی طویل ہے بادشاہوں کا حشر دکھا چکنے کے بعد اقبالؔ نے متذکرہ بالا اشعار رقم کیا ہے جن میں اُنہوں نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ یہ حشر صرف بادشاہوں ہی کا نہیں۔ بلکہ قوموں کا بھی ہوتا ہے اور اُن کی زندگیاں بھی اُتنی ہی بے اعتبار ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب ایک قوم گمرہی میں مُبتلا ہوتی ہے تو خُدا اُس کی جگہ دوسری قوم مسلّط کر دیتا ہے۔ کیونکہ اِس دُنیا کے نگیں کی زینت ہی یہی ہے کہ اس میں ہمیشہ نئے نام جوڑے جائیں۔ یہ

«مادرِ گیتی» یعنی دُنیا کی مثال ایک عورت کی ہے جس کے رحم میں ہمیشہ نئی قوم بنتی اور جنم لیتی ہے۔
(آبُستن کے معنی ہیں حاملہ ہونا)

مندرجہ بالا اشعار میں اقبالؔ نے سب سے پہلے شعر میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :-

«آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے (کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ) ۔» ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۱۹)

«ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے (کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ)، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے» ــــ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۵۷)

آخری شعر کو چھوڑ کر باقی سبھی اشعار میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :-

«کیا اِنہوں نے دیکھا نہیں کہ اِن سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دَور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، اُن پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں، (مگر جب اُنہوں نے کُفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُنھیں تباہ کر دیا اور اُن کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اُٹھایا» ــــ سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۶)

«ہم اِن سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے بہت زیادہ طاقت ور تھیں اور دُنیا کے مُلکوں کو اُنہوں نے چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟ اِس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے اُس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو، یا توجہ سے بات کو سنے» ــــ (سورۃ قٓ ۵۰۔ رکوع ۳)

«کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے یا اِن کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر

وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں" ــــ (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۶)۔

"کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اِس کے بعد ٹھہر سکی۔ پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ جس قوم کے پاس بھی اُس کا رسول آیا، اُس نے اُسے جھٹلایا، اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے، حتّٰی کہ اُن کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا۔ پھٹکار اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے" ــــ (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ رکوع ۳)

اِن ہی آیات کی ترجمانی اقبالؔ کے اِس شعر میں بھی ملتی ہے ؎

کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر!

("بالِ جبریل": "غزل ۲۹")

آخری شعر میں اقبالؔ یہ کلیہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ جب گمراہ قوم کو ہلاک کر کے ایک کے بعد ایک قوم لانا قانونِ فطرت ہے تو خُدا نے اُمّتِ محمدیہؐ کو بھی متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے بھی خدا اور اس کے رسُول کو جھٹلایا تو تمہاری جگہ پھر خدا کسی دوسری قوم کو لا کھڑا کرے گا۔ اِس شعر میں انہوں نے درج ذیل آیات کو ذہن نشیں کرایا ہے:-

"تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی اُنہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔ آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں، اللہ ہی مالک ہے اُن سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے، اور وہ اِس کی پوری قدرت رکھتا ہے" ــــ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۹)

"اگر اِس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا انتظام بگڑ جاتا۔ لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا افضل ہے

(کہ وہ اِس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)" ــــ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳۳)

"لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب اُنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر نہ دیا۔ اِس طرح ہم مجرموں کو اُن کے جرائم کا بدلہ دیتے ہیں۔ اب اُن کے بعد ہم نے تم کو زمین میں اُن کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو" ــــ (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دُنیوی زندگی کا یہ سب سر و سامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اُٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اُٹھائے گا، اور تم خُدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے" ــــ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۶)

"اگر تم مُنہ موڑ و گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے" ــــ (سورۃ محمد ۴۷۔ رکوع ۴)

---

(۱۰)

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!

("بانگِ درا" : "طلوعِ اسلام")

نظم "طلوعِ اسلام" سنہ ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اور یہ نظم مسرت اور شادمانی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اِس نظم کا پسِ منظر یہ ہے کہ گرچہ پہلی جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء) میں سقاریہ کے

جنگ میں یونانیوں کو شکست دے کر کم از کم موجودہ ترکی کو پھر سے واپس لے لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اسی لئے اقبال کو یہ امید بندھی کہ مسلمانوں کا آفتاب جو جنگِ عظیم میں غروب ہو چکا تھا پھر طلوع ہو رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے اِس نظم کا عنوان "طلوعِ اسلام" رکھا اور اس نظم میں جتنے اشعار ہیں مسرت اور شادمانی سے لبریز ہے جو اِس نظم کے پہلے ہی شعر سے واضح ہے ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تُنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی

زیرِ تجزیہ شعر میں "عروسِ لالہ" سے وہ افراد اور اشیاء مُراد ہیں جن میں ترقی کی صلاحیت پائی جاتی ہے یا جن کا وجود دُنیا کے لئے زیب و زینت کا موجب ہے۔ اقبالؔ نے "لالہ" کو بطور اصطلاح اپنے کلام میں بار بار استعمال کیا ہے جس سے انکی مُراد مسلمان قوم ہے۔ چنانچہ اِس شعر کے پہلے مصرعہ میں وہ مسلمانوں کو یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ تیرے اندر جو عشقِ رسولؐ کا وصف (جسے انہوں نے "خونِ جگر" سے تعبیر کیا ہے) پایا جاتا ہے اِس کی بدولت تیری ذات اس کائنات کی رونق بن گئی۔ اور دوسرے مصرعہ میں اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہوا چونکہ "تری نسبت براہیمیؑ ہے" یعنی تیری ملّت کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے جا ملتا ہے اور اسی وجہ کر تجھے "ملّتِ ابراہیمی" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی مصرعہ میں اِسی نسبت کے حوالے سے وہ یہ نکتہ بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی تو بھی اُسی جذبۂ ایمانی سے ایک نئی اسلامی دُنیا کا معمار بن سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیوارِ کعبہ اٹھاتے وقت یہ دُعا کی تھی کہ:۔

"اے رب، ہم دونوں [حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام] کو اپنا مسلمُ (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا، جو تیری مُسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" — (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۲۸)

زیرِ تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ کا یہ ٹکڑا: "تری نسبت براہیمیؑ ہے" تلمیح ہے درجِ ذیل آیات

کی:-

"ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اِس کی پیروی کی اور اب یہ نبیؐ اور اِس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں"۔ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳- آیت ۶۸)

"انہیں (منکروں کو) معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور مُلک عظیم بخش دیا مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے مُنہ موڑ گیا"۔ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳- رکوع - ۸)

دوسرے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑا: "معمارِ جہاں تو ہے" درجِ ذیل آیت کی یاد دلاتا ہے:-

"اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو (کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ) جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔ــــ (سورۃ آلِ عمران ۳- رکوع ۱۲)

---

(۱۱)

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَاتَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرْ!

("ضربِ کلیم": نظم: "لاہور و کراچی")

یہ نظم تین ہی اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ آخری شعر ہے۔ اِس شعر کا پسِ منظر اقبال نے پہلے شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے وہ یہ کہ ؎

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شَے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر!

زیرِ تجزیہ شعر میں درجِ ذیل آیات کی تلمیح کی گئی ہے:-

"پس اے نبیؐ، اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو (فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا اٰخَرَ)، ورنہ تم بھی سزا پانے والے میں شامل ہو جاؤ گے۔" ——
(سورۃ الشعراء ۲۶- آیت ۲۱۳)

"(اے نبیؐ)، اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو (وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا اٰخَرَ)، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے۔ فرمانروائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹنے جانے والے ہو" —— (سورۃ القصص ۲۸- رکوع ۹)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے (وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا اٰخَرَ)، جس کے لئے اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اُس کا حساب اُس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے (اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ)" سورۃ المؤمنون ۲۳- آیت ۱۱۷)

انہی قرآنی ارشادات کو اقبالؔ نے دوسری جگہ اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے ؎

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اُتر گیا جو ترے دل میں لَاشَرِیْکَ لَہٗ!

("ضربِ کلیم": "محراب گلُ افغان کے افکار" بند ۲)

---

(۱۲)

سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دُھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں!

("بالِ جبریل": "ذوق و شوق")

نظم "ذوق وشوق" کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے۔ اس نظم میں پانچ بند ہیں اور ہر بند چھ اشعار پر مُشتمل ہے۔ متذکرہ بالا اشعار پہلے بند کے ہیں۔ اقبالؔ نے نظم شروع کرنے کے لئے حضرت سعدیؒ کا درجِ ذیل شعر تحت العنوان لکھا ہے ؎

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

اس پہلے بند میں اقبالؔ نے یثرب (مدینۃ النبی) کے گرد ونواح کی ایک دلکش صُبح کا سماں باندھا ہے اور زیرِ تجزیہ اشعار میں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ رات کے وقت نواحِ مدینہ میں بارش ہوئی۔ اور صُبح کے وقت جب آفتاب نکلا تو اُس کی شعاعوں سے باقی ماندہ ٹکڑے ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے کسی نے کوہِ اضم کو سُرخ اور نیلی چادریں پہنا دی ہوں۔ بارش کی وجہ سے ہوا بالکل صاف ہوگئی اور درختوں کے پتے بھی دُھل گئے اور نواحِ کاظمہ کا ریت ریشم کی طرح چکنا ہوگیا۔

اِن اشعار میں اقبالؔ نے "کوہِ اضم" اور ریگِ نواحِ کاظمہ" کی جغرافیائی تلمیح کی ہے۔ اضم مدینہ منوّرہ کے نواح میں ایک پہاڑی ہے اور کاظمہ مدینہ منوّرہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ سرزمین حجاز میں یہ دونوں مقامات ایسے سمت میں واقع ہیں جن سے کسی زمانہ میں مصر وعراق کے کارواں حج وزیارت کے لئے گزرا کرتے تھے۔ علامہ بوصیریؒ کے مشہور نعتیہ قصیدہ کے درجِ ذیل شعر میں اِن دونوں مقامات کی طرف اشارہ ملتا ہے:۔

اَذْھَبَتِ الرِّیْحُ مِنْ تِلْقَاءِ کَاظِمَةٍ
وَاَوْمَضَ الْبَرْقُ فِی الظَّلْمَاءِ مِنْ اِضَمٍ

"کوہِ اضم" اور "کاظمہ" سے شاعر کا ذکر دیارِ حبیب تک جا پہنچتا ہے اور اِس سے اقبالؔ یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ یا تو مقامِ کاظمہ کی طرف سے جنّت کی ہوا چل پڑی یا اضم کی سمت سے رات کی تاریکی میں بجلی کوندی۔

(۱۳)

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ! ۔۔
خُدا وہ کیا کہ جو بندوں سے احتراز کرے

("بانگِ درا": غزلیات حصہ اول)

اس شعر میں اقبال نے واعظوں پر طنز کیا ہے کہ تم لوگوں کو بتاتے رہتے ہو کہ خدا تو عرش پر رہتا ہے یعنی وہ انسان سے کافی دور ہے اور تم نے "عرش" کو خُدا کی جائے سکونت قرار دے لی ہے چہ جائیکہ وہ تو انسان سے اتنا قریب ہے کہ اُس کے دل میں مکیں ہے۔ اگر تم تزکیہ نفس کر کے دیکھو تو اُسے دل میں موجود پاؤ گے۔ خدا تو خود فرماتا ہے کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں، اُس کی ہر باتیں سُنتے، اس کی ساری حرکتوں کو دیکھتے اور ہر وقت اُس پر نظر رکھتے ہیں۔ "عرش" کا ذکر قرآن میں اس طرح وارد ہوا ہے:۔

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا (ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ)۔

—— (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷)

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خُدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے (ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ) —— (سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۱)

"ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" کی آیت سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵ سورۃ الرعد ۱۳ رکوع ۱ اور سورۃ الحدید ۵۷ رکوع ۱ میں بھی وارد ہوئی ہے مگر "تختِ سلطنت" یا "عرش" کا لفظ خُدا کی دُنیا پر فرمانروائی اور سارے جہاں کا مالک کے معنوں میں آتا ہے نہ کہ کسی دُنیوی بادشاہ کی طرح اپنی رعایا سے بے خبر اور فاصلہ رکھنے کے معنی میں۔ قرآن میں کسی نکتہ کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایسے الفاظ ہی لائے گئے ہیں جن کی اصلیت اور ماہیت سے انسانی ذہن مانوس ہو۔ اقبال نے اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں واعظوں کے اِس طرزِ فکر کی تردید کی ہے جو مبنی ہے درجِ ذیل آیات پر:۔

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اُس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک

کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں"
——(سورۃ قٓ ۵۰۔ آیت ۱۶)

"وہ (خُدا) سب کچھ سُنتا ہے اور قریب ہی ہے (اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ قَرِیۡبٌ")
——(سورۃ سبا ۳۴۔ رکوع ۶)

"وہ (خُدا) تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو (وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ)
جو کام بھی تم کرتے ہو اُسے وہ دیکھ رہا ہے"——(سورۃ الحدید ۵۷۔ رکوع ۱)

---

(۱۴)

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے، کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

("بانگِ درا": غزلیات حصّہ اوّل)

اِس شعر میں اقبالؔ کی مخاطبت خُدا سے ہے اور وہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ میں تو عشق کی انتہا ہوں اور تو حُسن کی انتہا ہے مگر میں نے عشقِ رسولؐ میں گرویدگی پیدا کر کے اپنے کو تیرے بالکل قریب کر لیا ہے اور اب تیرا رنگ اختیار کر لینے پر لوگوں کو یہ مشکل ہو رہی ہے کہ جب شاہد و مشہود یعنی تو اور میں اب ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں تو وہ کبھی تجھے دیکھتے ہیں اور کبھی مجھے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس کا رنگ زیادہ گہرا اور شوخ ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ انسان کو یہ مرتبت اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے کو خُدا کے رنگ میں رنگ لے۔ یہ شعر درج ذیل آیت سے ماخوذ ہے:۔

"کہو: اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبۡغَۃَ اللّٰہِ)۔ اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے ہیں"——(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۳۸)

---

(۱۵)

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

("بالِ جبریل": "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں!")

نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں!" کُل پانچ اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ تیسرا شعر ہے۔ اِس نظم میں اقبالؔ نے آدم کی فطری صلاحیتوں کو فرشتوں کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے انسان کو منبعِ حسن و جمال ہونا ذہن نشین کرایا ہے۔ یہ شعر درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہے:۔

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا (لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ)" ــــــ سورۃ التین ۹۵ - آیت ۴)

"اُس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی بنائی (وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ)، اور اُسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے" ــــــ (سورۃ التغابن ۶۴ - آیت ۳)

"وہ اللہ ہی تو ہے .... جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی (وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ)" ــــــ (سورۃ المؤمن ۴۰ - رکوع ۷)

اقبالؔ نے اِس شعر میں اِنہی آیات کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ چونکہ تمہاری تخلیق خلیفۃ الارض کے منصبِ جلیلہ پر فائز کرنے ہی کے لئے کی گئی ہے اس لئے اتباعِ شریعت کی بدولت مرتبۂ کمال کو پہنچ کر اپنی تخلیق کے مقاصد کی تکمیل تم پر فرض ہے۔ تمہیں خدا نے وہ "جمال" عطا کیا ہے یعنی تم میں ایسی خوبیٔ صورت اور خوبیٔ سیرت عطا فرمائی ہے کہ تو اگر خواب میں بھی اپنے اس "جمال" کو دیکھے تو یہ ہوش میں رہ کر اپنی خوبیاں جاننے سے کہیں بہتر ہے۔

ایسے تو خدا نے اِس عظیم الشان کائنات میں بے حد و حساب چیزیں بنائی ہیں مگر کوئی چیز ایسی نہیں جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو اور اپنا الگ حسن نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ اپنی منجملہ تخلیق پر خدا

خود فرماتا ہے کہ :۔

" جو چیز بھی اُس نے بنائی خوب ہی بنائی "۔۔۔۔ (سورۃ السجدہ ۳۲۔رکوع ۱)

انسان کے بہترین ساخت (اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ) جسے اقبالؔ نے جمالؔ سے تعبیر کیا ہے، کا مطلب صرف اعلیٰ درجہ کا جسم ہی نہیں بلکہ فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئی ہیں کیونکہ اُسے اُن تمام موجودات پر حکمرانی کرنی ہے جو زمین اور اس کے گرد و پیش میں پائی جاتی ہیں۔ سورۃ "التغابن ۶۴" کی مندرجہ بالا آیت میں یہ بھی ساتھ ساتھ فرمایا گیا ہے کہ " اور اُسی کی طرف تمہیں پلٹنا ہے "۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خُدا نے یہ ساری صلاحیتیں اس لئے بخشی ہیں تاکہ وہ روزِ حشر یہ محاسبہ کر سکے کہ "بہترین ساخت" پر پیدا کئے جانے پر اُس نے کہاں تک اپنے اختیارات کو ذمہ دارانہ طور پر استعمال کیا۔

---

(۱۶)

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

("ضربِ کلیم" : "موت")

یہ نظم کل تین ہی اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ آخری شعر ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

" قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں (وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا)،
اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں (وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا)"۔۔۔۔

(سورۃ النّٰزِعٰت ۷۹۔ رکوع ۱)

مندرجہ بالا شعر میں اقبالؔ نے یہ قرآنی نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ موت سے انسان کا وجود معدوم نہیں ہوتا بلکہ اُس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ دوسرے یہ کہ موت کے جو چیز قبضہ میں لی جاتی ہے وہ انسان کی حیوانی زندگی نہیں بلکہ اُس کی وہ خودی یا انا قبضہ میں لی جاتی ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے

الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ "انا" دُنیا میں جیسی شخصیت بناتی ہے وہ پوری کی پوری نکال کر قبضہ میں لے لی جاتی ہے اور یہی چیز رب کے حضور پیش کی جاتی ہے جسے روزِ حشر نیا جسم اور نیا جسم دے کر اُس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ "وجود" کیا ہے۔ "ضربِ کلیم" کی نظم "آدم" میں اقبال کہتے ہیں ؎

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں

وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن!

قرآن کی رو سے وجود نہ حیات ہی تک وابستہ ہے اور نہ موت ہی اسے فنا کرتی ہے بلکہ اس کا سلسلہ "حیات بعد الممات" تک قائم رہتا ہے۔ "ضربِ کلیم" ہی کی نظم "افرنگ زدہ" میں اقبال خود ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ: وجود کیا ہے"؟ اور خود ہی یہ جواب دیتے ہیں ؎

وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود

کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا!

اقبال کے نزدیک انسان کا حریمِ وجود صرف خودی کو خدا نما بنانے پر ہی روشن ہو سکتا ہے اور جسے "حیات" کہتے ہیں وہ اِسی خودی کے سرور و سوز و ثبات کا دوسرا نام ہے ؎

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود

حیات کیا ہے؟ اُسی کا سرور و سوز و ثبات

("ضربِ کلیم": "تیاتر")

اِس عارضی اور فانی دُنیوی زندگی کے خاتمہ پر انسانی وجود فنا نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنے وجود کو خودی سے مستحکم کرے تو اُس کا وجود بھی غیر فانی اور ابدی ہو جاتا ہے۔ "ضربِ کلیم" ہی کی نظم "وجود" میں اقبال نے اس پر اس طرح بھی روشنی ڈالی ہے ؎

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود

کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود

اقبال نے "شخصیت" کو وجودِ انسانی کا نقطۂ مرکزی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کو لکھے گئے ایک خط میں اُنہوں نے وجودِ انسانی کی ماہیت پر اِس طرح اپنے خیالات کا

اظہار کیا ہے :-

"جہاں تک انسان کا تعلق ہے اُس کا وجود نقطۂ مرکزی شخصیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی شخصیت جوش اور ولولے کی ایک کیفیت ہے شخصیت کے تصور کی بدولت ہمیں ایک معیارِ قدر حاصل ہو جاتا ہے جسے کسوٹی بنا کر خیر و شر کو پرکھا جا سکتا ہے۔ شخصی بقا اُسی کو حاصل ہوگی جو اپنی زندگی میں فکر و عمل کے طریقے اختیار کر کے جوش اور ولولے کی کیفیت پر قائم رہے۔ اگر ہمارے عمل کا مقصد یہ ہوگا کہ شخصیت کے جوش اور ولولے کی کیفیت قائم رہے تو موت کا صدمہ بھی اُسے متاثر نہ کر سکے گا۔"

اقبالؔ کے نزدیک یہی جوش اور ولولہ عشق ہے جو تحصیلِ علم کا وجدانی ذریعہ بنتا ہے اور عرفان کہلاتا ہے اور جو زندگی کو دوام بخشتا ہے۔

---

(۱۷)

عیش کا پُتلا ہے محنت ہے اُسے ناسازگار	کارخانہ کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار	حُکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

("بانگِ درا": "ظریفانہ")

پہلے شعر میں اقبالؔ نے سرمایہ داروں کو نہایت پست فطرت، نااہل، عیش پسند اور کاہل قرار دیا ہے۔ اور دوسرے شعر میں قرآنی آیت کا حوالہ دے کر یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ خُدا کا حکم تو یہ ہے کہ انسان اُس شیئے کا حقدار ہے جس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرے۔ اس لئے اِن کارخانہ کے مالکوں کو کیا حق ہے کہ مزدوروں کی محنت کا پھل کھائیں۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں سورۃ "النجم ۵۳" کی درج ذیل آیت ۳۹ کی تلمیح کی گئی ہے :-

"اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے (وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی)۔"

مندرجہ بالا آیت اُن تنبیہوں میں سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں اور اِن تنبیہات کا ذکر سورۃ "النجم ۵۳" کی آیت ۳۶ کے بعد وارد ہوئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ سے مُراد توراۃ ہے۔ رہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے تو وہ آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر "صُحُفِ ابراہیمؑ" کی تعلیمات کے بعض اجزا نقل کیے گئے۔ ایک اِس سورۃ کی آیت ۳۷ اور دوسرا سورۃ "الاعلیٰ ۸۷" کی آیات ۱۸ اور ۱۹ میں۔

اقبال ساری عمر کاشتکاروں پر جاگیرداروں کے اور مزدوروں پر سرمایہ داروں کے ظُلم پر نوحہ خوانی کرتے رہے۔ تنگ آکر وہ انتہائی عجز و انکساری سے خُدا سے یہاں تک پوچھ بیٹھے:۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دُنیا ہے تری مُنتظرِ روزِ مکافات!

("بالِ جبریل": "لینن (خُدا کے حضور میں)")

---

(۱۸)

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ!

("بالِ جبریل": غزل ۱۱)

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے کچھ ذاتی معاملات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کبھی تو اُن کی شاعری میں زبان، الفاظ، تراکیب و املا وغیرہ تک کی غلطیاں نکالی جاتی تھیں۔ اور جب اُنہوں نے نظم "شکوہ" لکھی تو اُن پر کفر تک کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ مگر ان سب کے باوجود اقبال خُدا کے شکر گزار تھے کہ اُس کی "بندہ پروری" سے دن بہت چین سے گزر رہے ہیں۔ وہ یہ باتیں کہہ کر درجِ ذیل آیات کی یاد دلاتے ہیں:۔

"اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے (وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا)"۔

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا = چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

("بانگِ درا" نظم "سرگزشتِ آدم")

پہلے شعر میں "دانشِ حاضر" سے مُراد یورپی فلسفہ اور سائنس یا حکمتِ غرب ہے جو لادینیت اور مادیت پر مبنی ہے۔ "سحرِ قدیم" سے مُراد ساحرانِ مصر ہیں جو فرعون کے دربار میں رہتے تھے اور "چوبِ کلیم" سے "عصائے موسیٰؑ" مُراد ہے جس میں ہر قسم کے طلسم اور سحر کو باطل کر دینے کی تاثیر موجود تھی اور جس نے فرعون کے ساحروں تک کو ایمان لانے پر مجبور کیا۔ اِس شعر میں ان ساری باتوں کے حوالوں سے اقبالؔ مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ موجودہ تعلیم اور طرزِ فکر تو سحرِ قدیم جیسی ہے جو باطل کو حق بنا کر پیش کیا کرتی تھی اس لئے اِس زمانے میں پھر اُسی ایمانی طاقت (یعنی چوبِ کلیم) کی ضرورت ہے جو حق کے خلاف باطل کا مقابلہ کر سکے۔

دوسرے شعر میں "فرعون" اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد "باطل کا داعی" ہے۔ یہاں بھی اقبالؔ یہی کہتے ہیں کہ کفر اور اسلام، باطل اور حق ایک دوسرے سے ہر زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں مگر مجھے اِس کا کوئی غم یا اِس کی کوئی فکر اِس لئے نہیں کہ میرے آستیں میں "یدِ بیضا" ہے یعنی میں حکمتِ کلیمی کا وارث ہوں۔ میرے پاس بھی وہی معجزہ ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو عطا کیا تھا۔ جس کی مدد سے اُنہوں نے فرعون کو شکست دی تھی۔

تیسرے شعر میں بھی اسی نورِ ازل (یعنی "یدِ بیضا") کے زیرِ آستیں چھپانے کی بات ہے۔ "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" اُن نشانیوں میں سے ہیں جو خُدا نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے دربار میں دعوتِ حق دینے اور باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے عطا فرمائی تھیں۔ اقبالؔ کی یہ دونوں اصطلاحیں درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہیں:۔

"اور تمہیں (نبیؐ کو) کچھ موسیٰؑ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اُس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ: ذرا ٹھیرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اِس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے"

"وہاں پہنچا تو پکارا گیا: "اے موسیٰؑ! میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں اُتار دے۔ تو وادیٔ مقدس طویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چُن لیا ہے، سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اُس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔ پس کوئی ایسا شخص جو اُس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اُس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے، اور نہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا"۔۔۔ اور اے موسیٰؑ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اُس سے لیتا ہوں"۔ فرمایا: "پھینک دے اس کو موسیٰؑ"۔ اُس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھا جو دوڑ رہا تھا۔ فرمایا: "پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے"۔۔۔

۔۔۔ (سورہ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱)

اقبال جب اِن آیات سے "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" کی اصطلاحیں وضع کرتے ہیں تو وہ یہ بات بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ اِن سے باطل کا مقابلہ اُسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ "ایمان" ہو جس کی تلقین خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو، مندرجہ بالا آیات میں اِن نشانیوں کو عطا کرنے کے قبل وحی کے ذریعے کی تھی اور موجودہ اُمتِ مسلمہ کے لئے تو یہ وحی قرآن کی شکل میں موجود ہے صرف ہاتھ میں لاٹھی اور آستین میں ہاتھ چھپانے سے تو وہ "ضربِ کلیمی" نہیں لگ سکتی جو حضرت موسیٰؑ نے لگائی تھی۔

فرعون کے دربار میں "چوبِ کلیم" اور "یدِ بیضا" کے کرشموں کے متعلق ارشاد ہے:۔۔۔

"(پھر اُن قوموں کے بعد جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر اُنہوں نے

بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، پس دیکھو کہ اِن مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ موسیٰؑ نے کہا: "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیلِ ماموریّت لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔" فرعون نے کہا: "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو اُسے پیش کر۔" موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔ اِس پر فرعون کے قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ: "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، اب کہو کیا کہتے ہو؟" پھر اِن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اِس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہرِ فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔ اُنہوں نے کہا: اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اِس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟" فرعون نے جواب دیا: "ہاں، اور تم مقربِ بارگاہ ہوگے۔" پھر اُنہوں نے موسیٰؑ سے کہا: "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟" موسیٰؑ نے جواب دیا: "تم ہی پھینکو۔" اُنہوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔ ہم نے موسیٰؑ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اُس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ اُن کے اس جھوٹے طلسم کو نگل گیا۔ اِس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ اُنہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا (فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا

كَانُوا يَعْمَلُونَ) ۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کی بجائے) اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: "ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ (حضرت موسیٰؑ کے حقیقی بھائی) مانتے ہیں"۔ — (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۳ اور ۱۴)

"چوبِ کلیم" کے معجزات پر سورۃ "الشعراء ۲۶ کے رکوع ۴ میں اسی قرآنی قصہ پر آگے فرمایا گیا ہے:۔

"ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ تمہارا پیچھا کیا جائے گا"۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لئے) شہروں میں نقیب بھیج دیئے (اور کہلا بھیجا) کہ: "یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں، اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے، اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے"...... صبح ہوتے یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰؑ کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ: "ہم پکڑے گئے"۔ موسیٰؑ نے کہا: "ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا"۔ ہم نے موسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ "مار اپنا عصا سمندر پر۔ (فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ)"۔ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اُسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰؑ اور اُن سب لوگوں کو جو اُس کے ساتھ تھے ہم نے بچا لیا، اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ اس واقعہ میں ایک نشانی ہے، مگر اِن لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

"چوبِ کلیم" کے معجزہ پر سورۃ البقرہ ۲ کے رکوع ۷ میں ایک واقعہ اس طرح بھی وارد ہوا ہے:۔

"یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) کے لئے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ "فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ)"۔ چنانچہ

اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اُس کے پانی لینے کی ہے۔"

"یدِ بیضا" کی اصطلاح سے مضمون آفرینی کی ایک دلکش مثال "بانگِ درا" کی نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") کے درجِ ذیل شعر میں دیکھیے جو اقبال جیسے قادر الکلام شاعر ہی سے ممکن ہو سکتا ہے ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

حضرت بلالؓ حبشی سیاہ فام تھے مگر اقبال عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کا یہ نکتہ اس شعر میں پیش کرتے ہیں کہ اس عشق کی بدولت حضرت بلالؓ کی شخصیت اس قدر دلکش ہو گئی کہ اگرچہ وہ سیاہ فام تھے لیکن مومنوں کی نظر میں اُنؓ کی سیاہ رنگت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ سفید معلوم ہوتی تھی۔ پہلے مصرعہ سے "عشقِ رسولؐ" مراد ہے۔

---

(۱۵) لَنْ تَرانی:

صدائے لَنْ تَرانی سُن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضا کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے ماروں میں

("بانگِ درا": غزلیات حصہ دوم)

کھُل جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیثِ لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

("بالِ جبریل" : رباعی بعد از نظم: "ہسپانیہ")

"لن ترانی" کی اصطلاح درجِ ذیل آیات سے ماخوذ ہے:

"ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب دروز کے لئے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد

میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔ موسیٰؑ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ: "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔" جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اُس کے رب نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے التجا کی کہ: "اے میرے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں (قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ)" فرمایا، "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا (قَالَ لَن تَرَانِي)، ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔" چنانچہ اُس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔" فرمایا: "اے موسیٰؑ، میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا۔" (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۷)

---

(۱۶) براہیمی نظر:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

("بانگِ درا": نظم "طلوعِ اسلام")

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

("بانگِ درا": نظم "خضرِ راہ۔ صحرانوردی")

اقبالؔ نے "براہیمی نظر" سے مُراد دل کی بصیرت لی ہے اور اسے "چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ" سے بھی موسوم کیا ہے۔ اسی نظر کے عطا کئے جانے کی دُعا مانگنے کی تاکید اُنہوں نے درج ذیل شعر میں کی ہے۔ کیونکہ دیکھنے کو تو ظاہری آنکھوں سے خُدا کی نشانیوں کو سب دیکھتے ہیں مگر پھر بھی اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے یہی "براہیمی نظر" "دلِ بینا" بھی ہے ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

("بالِ جبریل": غزل ۲۰)

اقبالؔ نے یہ اصطلاح درج ذیل آیات سے لی ہے جو "دلِ بینا" کی بہترین مثال ہے:۔

"ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا: "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں" ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا انتظامِ سلطنت دکھاتے تھے اور اِس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اُس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھا: "اے برادرانِ قوم، میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں" ——— (سورۃ الانعام ۶۔ رکوع ۹)

اقبالؔ نے اسی "براہیمی نظر" کو "نگاہِ شوق" کا بھی نام دیا ہے اور "ضربِ کلیم" میں اسی نام کی نظم میں اس "نگاہِ شوق" کے مُضمرات اور معجزات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے صرف دو اشعار درج ذیل ہیں:۔

نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی! کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی! نگاہِ شوق میسّر نہیں اگر تجھ کو

---

(۱۷) اُمُّ الکتاب:

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب!
("ضربِ کلیم": "علم و عشق")

اِس بند میں اقبالؔ نے عشق کا سرچشمہ "اُمُّ الکتاب" کو بتایا جب کہ علم کا سرچشمہ وہ دُنیوی کتابیں ہیں جن سے انسان ادراک حاصل کرتا ہے۔ عشق کا فلسفہ، روزِ ازل سے، ایک ایسی کتاب میں ہے جو سب کتابوں کی ماں ہے۔ اقبالؔ نے "اُمُّ الکتاب" کی اصلاح میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:-

"حٰمٓ۔ قسم ہے اُس واضح کتاب کی کہ ہم نے اِسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اِسے سمجھو۔ اور درحقیقت یہ اُمُّ الکتاب میں ثبت ہے (وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ)، ہمارے یہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب۔ اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمہارے یہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لئے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟" —— (سورۃُ الزّخرف ۴۳۔ رکوع ۱)

اِس "اُمُّ الکتاب" کو سورۃ "الواقعہ ۵۶" کے رکوع ۳ کی درج ذیل آیات میں "(كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ)" بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا گیا:-

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔ کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت (فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ)۔ جسے مُطَهَّرِیْن کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل

بارھواں بند

عدل = انصاف

قصور = محلات = یہ قصر (محل) کی جمع ہے

طور = پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے خُدا کا جلوہ دیکھا تھا

فاطرِ ہستی = کائنات کا پیدا کرنے والا

مُسلم آئیں ہوا کافر یعنی اگر کافر مسلمانوں کے آئین یعنی اُس کے قانون پر چلنے لگے

موسیٰؑ = یہاں پر آرزومند مراد ہے

تیرھواں بند

مَنفعت = سودمندی، فائدہ

بُتکدہ = بُتخانہ (اردو شاعری میں عبادتگاہ کے معنی میں مستعمل ہے)

حرمِ پاک = مُرادخانۂ کعبہ ہے

چودھواں بند

تارک = ترک کرنے والا - چھوڑنے والا

معیار = کسوٹی

طرزِ سلف = بزرگوں کا طریقہ

آئین = قائدہ، دستور، قانون

شعارِ اغیار = غیر مسلموں کی تہذیب اور اُن کا تمدن

پندرھواں بند

زحمت = تکلیف

مِلّتِ بیضہ = اُمّتِ مُسلمہ

اُمرا = امیر کی جمع ہے۔ دولتمند اور رئیس لوگ

سولھواں بند

واعظِ قوم = قوم کے رہنما

برقِ طبعی = ذہانت، دانشمندی

روح بلالی = حضرت بلالؓ کا عشقِ رسولؐ مُراد ہے

تلقینِ غزالی = یعنی عشق رسولؐ کا پیغام

خندہ زن = ہنسنا

دستِ موسیٰؑ = حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی چمک جو خدا نے انہیں عطا کی تھی جسے "یدِ بیضا" کہتے ہیں

سَطوت = شان

پُختہ خیالی = یقین - ارادہ

شُعلہ مقالی = پُرجوش تقریر

تلقین = تعلیم

ناشکیبا = بے صبر

ظُلمت = تاریکی (یہاں پر حضرت بلالؓ کے سیاہ رنگ کی طرف اشارہ ہے)

رومی = مولانا روم جنہیں اقبال اپنا پیر مرشد مانتے تھے

نذرِ برہمن = اس سے مراد غیر اسلامی طرزِ فکر ہے

حبشی = اس سے مراد حضرت بلال رضؓ ہیں جو ملکِ حبش موجودہ ایتھوپیا کے رہنے والے تھے

سترھواں بند

نابود = ختم ہو جانا۔ جس کا وجود ختم ہو جائے

دَہر = زمانہ

پاس = لحاظ - خیال

صنم = بُت - مجازی معشوق

حُدی = وہ گیت جو شُتربان اونٹ کو ہانکتے وقت گاتے ہیں جس سے مست ہو کر اونٹ تیز چلتا ہے۔

حدی خواں = اونٹ کو تیز چلانے کے لئے گیت گانے والے

اٹھارواں بند

صداقت = سچائی

لوثِ مراعات = لوث کے معنی ہیں ملاوٹ، آلودگی اور مراعات کے معنی سلوک اور رعایت کے ہیں

حیا = شرم

فَوق الادراک = عقل سے بالاتر۔ ادراک درک کی جمع ہے بمعنیٰ عقل

نصاریٰ = عیسائی

عدل = انصاف - قوی = مضبوط

شجر = درخت۔ شجرِ فطرتِ مُسلم سے مراد مسلمانوں کی وہ فطرت جو بحیثیت مسلمان اُسے عطا کی گئی ہے۔

نمناک = تری سے بھرا ہوا

شجاعت = بہادری

دُنیا کی امامت اس سے مراد "خیر اُمت" ہے۔ دیکھو سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۱۰ اور سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۷۸ کے شروع کا دوسرا ٹکڑا۔

اُنیسواں بند

جوہر = قیمتی اور اصل ہر شے کی۔ یہ لفظ گوہر کا مُعرّب ہے بمعنی سنگ۔

باطل = جھوٹ۔ یہ قرآن میں "حق" کا تضاد ہے

ازبر = زبانی

بیسواں بند

اندازِ مسلمانی = اس سے اشارہ اتباعِ رسول ﷺ کی طرف ہے

دولتِ عثمانی = اس سے مراد حضرت عثمان رضؓ کی نیکی ہے

خوار = ذلیل

تارک = ترک کرنے والا

حیدری فقر = اس سے مراد حضرت علیؓ کی دنیا سے بے نیازی و بے رغبتی کی شان ہے

اسلاف = سلف کی جمع ہے بمعنی اگلے وقتوں کے بزرگ ۔ اقبالؔ نے یہ لفظ یا نہ تر صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے لیے استعمال کیا ہے۔

اکیسواں بند

خطا بیں = کسی کے عیب کو ڈھونڈنا

اوج = بلندی

فغفور = نام چین کے ایک بادشاہ کا فغفور اصل میں فغپور تھا۔ فغ بمعنی بُت اور پور بمعنی پسر چونکہ اُسکے ماں اور باپ نے اُسے بُت کی نذر کر دیا تھا اس لیے اُسکا نام ہے

خطا پوش = کسی کے عیب کو چھپانا

ثُریّا = پروین ۔ ستارہ

سریر = تخت، بادشاہت ۔ نعمت

کےَ = دیکھیں چھٹا بند میں "کیَ" کے معنی

حمیّت = ننگ، شرم، غیرت

بائیسواں بند

شیوہ = طریقہ، ہُنر، طرزِ روش

خوددار = کسی بھی قیمت پر اپنے نفس کو بُرے میلانات سے ملوث نہ کرنا

گفتار = گفتگو، تقریر، بات چیت

کِردار = عمل، فعل

کنار = بغل، آغوش

صفحۂ ہستی = تاریخ، دُنیا

اُپدیشک = ہندی لفظ ہے بمعنی واعظ

غیور = غیرت دار

اخوّت = محبت، بھائی چارہ

سراپا = تمام و کمال ۔ اوّل سے آخر تک

گلستاں = باغ

حکایت = قصّہ

صداقت = سچّائی

موہ لینا = اپنی طرف کھینچ لینا

تیئیسواں بند

انجم = دیکھیں "حلِ لُغات" نواں بند

بُتِ ہندی = غیر اسلامی طرزِ فکر

شوقِ پرواز = ترقی کرنے کی آرزوئیں

نشیمن = گھونسلہ

تہذیب = اس سے یہاں پر مراد مغربی تہذیب ہے

ہر بند سے آزاد کیا = دینِ اسلام کی جتنی پابندیاں تھیں اُن کو اُن سے اِس تہذیب نے آزاد کر دیا۔

خام = کمزور

افکار = فکر کی جمع ہے

بازیچہ = کھلونا

تاویل = مطلب نکالنا

اُفق = آسمان کا کنارہ

برہمن بھی ہوئے = غیر اسلامی طرزِ عمل اختیار کیا

مہجور = لفظ ہجر سے ہے بمعنی جُدا ہونا

مہجورِ نشیمن بھی ہوئے = یعنی مسلمانوں نے اپنی تہذیب تمدن اور ثقافت کا جو معیار قائم کر رکھا تھا اُس سے جُدا ہو کر ترقی کی آرزو میں غیر اسلامی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے شکار ہو گئے

لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا = ایک خدا کی پرستش کے بجائے دُنیوی خداؤں کی پرستش شروع کر دی اور گمراہی میں مبتلا ہو گئے

حُرّیت = آزادی

آتشکدۂ پارس = پارس فارس یعنی ایران کو کہتے ہیں یعنی وہ پارسیوں کی طرح آگ کی پرستش کرنے لگا

محبوس = قیدی

چوبیسواں بند

قیس = نام مجنوں کا جو لیلیٰ کا عاشق تھا یہاں پر مسلمان مُراد ہے

صحرا = میدان، ریگستان

بادیہ = جنگل۔ پیمائی بمعنی ناپنا

حجاب = پردہ

جَور = ظلم

بیداد = ظلم

زحمت = تکلیف۔ زحمت کش یعنی تکلیف اٹھانے والا

قیس زحمت کشِ صحرا نہ ہوئے = یعنی مسلمانوں میں اب عشقِ رسولؐ میں کوئی گرویدگی یا تڑپ باقی نہ رہی

بادیہ پیمائی = جنگل یا ریگستان میں مارے پھرنا

گلہ = شکایت

شکوہ = شکایت

عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو = یہاں عشق سے مراد عشقِ رسولؐ ہے اور حُسن (لیلیٰ) کے معنی خدا ہے یعنی جب عشق میں کُھلائے گرمی دیکھی تو خدا نے بھی منہ پھیر لیا

پچیسواں بند

عہدِ نو = نیا زمانہ، عصرِ حاضر

آتش = آگ

ایمن = بچا ہوا

شعلہ بہ پیراہن = تباہ ہو جانا۔ کپڑے میں آگ لگ جانا

اسپند = اسپند کے دانہ کی یہ خاصیت ہیکہ جب اسے آگ میں ڈالا جاتا ہے تو چٹخ جاتا ہے اور چٹخنے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر اس سے اقبال نے ضبط و تحمل میں کمی کے مترادف قرار دیا ہے

برق = بجلی

خرمن = کھلیان

کہن = پرانا

افرنگ = اس سے مراد یورپ اور مغربی طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہے جو لادینی افکار پر قائم ہے

چھبیسواں بند

کوکب = روشن ستارہ

گل برانداز = پھول برسانا

عنابی = انگور کا رنگ

خس و خاشاک = جنگل جھاڑ

گردوں = آسمان

افق تابی ہے = آسمان کا کنارہ روشن ہے

ستائیسواں بند

ثمر چیدہ = کامیاب

کاہیدہ = گھٹے ہوئے ۔ بالیدہ = بڑھے ہوئے

ثمر = پھل ۔ نخل = درخت

بطن = پیٹ، شکم ۔ برومندی = کامیابی

اٹھائیسواں بند

بانگِ درا = گھنٹے کی آواز ۔ یہاں پر دینِ اسلام کا دامن مراد ہے

معمور = آباد ۔ بھرا ہوا

شب گریزاں ہوگی = یعنی رات کی تاریکی دور ہوگی

انتیسواں بند

مئے = شراب ۔ پیمانہ = ناپنے کا آلہ

پاسباں = پہرہ دار

فغاں = نالہ، فریاد

عیاں = ظاہر ۔ یورش = حملہ

عصرِ نو = نیا یا موجودہ زمانہ جو تاریکی سے گزر رہا ہے

ایام = یوم کی جمع یعنی دن ۔ یہاں پھر زمانہ مراد ہے

تیسواں بند

بلغاری = وسطی یورپ کے ملک بلغاریہ کے باشندہ

ایثار = قربانی

فرس = گھوڑا ۔ اعدا ۔ ج دشمن

نشتر = زخم کا اوزار، ڈنک، نیش

دل آزاری = دلی تکلیف

ہراساں = پریشان ۔ صہیل = گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز

بندۂ حر = آزاد اور اچھا انسان

نوش = شہد

اکتیسواں بند

خفی = پوشیدہ

کوکبِ قسمتِ امکاں = یعنی دنیا کی تقدیر کا ستارہ

ہفتِ کشور = سات اقلیم ہیں اور سات ستارے ہیں جو چلتے ہیں۔ ایک اقلیم ایک ستارہ سے متعلق ہے۔

تفنگ = بندوق

چرخ = آسمان ــ مکیں = مکان میں رہنے والا

جاوداں = ہمیشہ ــ گِل = مٹّی

ارمغاں = تحفہ

محفلِ ہستی = دُنیا

بحرِ بے پایاں = اتھاہ سمندر

اقلیم = ساتواں ٹکڑا ربع مسکون کا

تسخیر = تابع کرنا۔ اپنی طرف کرنا

لم یزل = ہمیشہ۔ کنایہ ذاتِ حق تعالےٰ سے

ازل = جس کا شروع نہ ہووے۔ ابد = ہمیشہ جس کا ختم نہ ہو

عالمِ جاوید = جاوید کے معنی ہمیشہ دائم اور عالمِ جاوید سے جنّت مراد ہے

دُنیا کی امامت = دیکھیں اٹھارھواں بند

بتیسواں بند

رَخت = سامان ــ بردوش = کندھے پر

تُنک مایہ = مفلس، کمزور

رخت بردوش = آمادۂ سفر

بیاباں = ویرانہ

تینتیسواں بند

چمنِ دہر = دنیا۔ موجودہ زمانہ

تپش آمادہ = متحرک

لَوح = تختی ــ الکتاب = قرآن

ریگ = بالو، ریت

خُم = مٹکا یا پیپہ شراب کا

صدیق رضؓ = پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

محیط = گھیرا ــ حُباب = پانی کا بلبلہ

چوتیسواں بند

دشت = صحرا، بیاباں ــ بحر = سمندر

مراقش = شمالی افریقہ کا ایک مسلم ملک جسکو "مورکو" کہتے

پینتیسواں بند

مردُم = آنکھ کی پُتلی

مہر = سورج ــ پروردہ = پالا ہوا

چھتیسواں بند

سِپر = ڈھال ــ شمشیر = تلوار

عشق = اس سے مراد عشقِ رسولؐ ہے

مضمون: اقبال اور تفضیلِ علیؓ

شُہرہ = شہرت ۔ صوفی منشی = پارسائی

مُضمر = پوشیدہ ۔ معانی = معنی کی جمع ہے

دُرد = تلچھٹ

رِند = وہ منکر جس کا انکار شرعی باتوں سے ازروئے عقلمندی کے ہو نہ کہ بسبب جہالت ۔ شراب پینے والوں کے معنی میں آتا ہے

کلیم ہمدانی = یہ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دربار میں "ملک الشعراء" تھے جنہوں نے ۱۰۶۱ھ میں بمقام سرینگر (کشمیر) میں وفات پائی

خاک اُڑانی = مذاق اڑانا ، توہین کرنا

اَضداد = ضِد کی جمع ہے

منصور = پورا نام حضرت حسین منصور حلاجؒ ۔ یہ حضرت جنید بغدادی کے دور میں بہت بڑے اولیا گزرے ہیں "انا الحق" کہنے کی وجہ کر ان کو پھانسی دی گئی

اعالی و ادانی = اعلیٰ اور ادنیٰ کی جمع ہے یعنی بڑے اور چھوٹے

مئے زُہد = تقویٰ کی پابندی

خیالِ ہمہ دانی = یعنی اپنے عالم اور خدا رسیدہ ہونے کا غرور

شناسا = جان پہچان والے ۔ قمری ۔ ایک پرندہ کا نام ہے

شمشاد = ایک درخت جو بہت خوشنما اور بلند ہوتا ہے ۔

معانی = اس کے اصطلاحی معنی تو علم معانی کے ہیں مگر یہاں پر اس سے مراد فنِ شاعری ہے

قمریٔ شمشادِ معانی = یہاں پر بہت بلند پایہ شاعر مراد

تشیّع = شیعہ مذہب کی طرف میلان

تفضیلِ علیؓ = حضرت علیؓ کی فضیلت

عار = شرم ۔ حُسن فروشوں = شاہدانِ بازاری

دلِ دفترِ حکمت = یعنی بڑا عالم فاضل ہے

خفقان = دل دھڑکنے کا مرض ، بیقراری

نغز بیانی = بلند پایہ اور حقائق سے لبریز گفتگو

اَحِبّا = جمع حبیب کی بمعنی دوست

قصورِ ہمہ دانی = یعنی آپکی علمیت میں اس سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوسکتا

تمسخُر = ہنسی ، دل لگی ، مذاق

کاس الکرام = کاس بمعنی شراب کا پیالہ اور کرام کے معنی ہیں بہت بڑا کریم اور سخی

امیرِ جنود = جنود کے معنی لشکر اور امیر بمعنی سردار یعنی سپہ سالار

مِضراب = ستار بجانے کا اوزار

اسد اللّٰہی = اسد کے معنی ہیں شیر ۔ اللہ کا شیر

اسرار = بھید ، نانِ جوین ، جَو کی روٹی

ستیزہ گاہ = میدانِ جنگ

فطرت اسد اللّٰہی = اسد سے مراد حضرت علیؓ ہیں

قیصر = روم کے بادشاہ کا لقب

بزرہ قربِ مکانی = مکان کے قریب رہنے کی وجہ کر

اشک فشانی = آنسو بہانا

صہبا = انگور کی شراب

فقیہہ = عالم، دانا، علم فقہ کا جاننے والا

ابن السبیل = مسافر

نَے = بانسری

روباہی = دغابازی، روباہ کے معنی ہیں لومڑی

شرر = چنگاری ـــ سِر = راز

نانِ شعیر = جَو کی روٹی

مرحبی = جنگ خیبر میں یہودیوں کا سردار جو مارا گیا۔ عنتری بھی اسی کے ساتھ تھا

مضمون: شبانی سے کلیمی دو قدم دور ہے

شبانی = بکری یا جانور چرانا۔ شبان کے معنی چرواہا کے ہیں

عارف = ولی ـــ نسیم = صبح کی ٹھنڈی ہوا

کلیمی = حضرت موسیٰ کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ کیلئے اس مضمون میں دیکھیں۔ یہاں پر پیغمبری مراد ہے

تمہید = شروع ـــ کلیم الٰہی = اللہ کی پیغمبری

مضمون: کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

کتاب خواں = کتاب کا پڑھنے والا

فراغ = فرصت ـــ برنا = جوان

رَے = نام ایک شہر کا

لولاک = دیکھیں مضمون: "اقبال کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات" کا ذیلی عنوان "لولاک"۔ نمبر شمار ۱۱

نہاد = بنیاد ـــ عارفانہ = پارسائی

خیرہ = آنکھوں کا چوندھیانہ

رعنائی = زیبائی

اہلِ دانش = عقلمند لوگ، عالم

صاحبِ کتاب = قرآن کا پیرو۔ قرآن کو "الکتاب" بھی کہا گیا ہے

پیر = بوڑھا

"خُلقِ عظیم" = دیکھیں مضمون: "اقبال کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات" کا ذیلی عنوان "خلق عظیم"۔ نمبر شمار (۲)

صاحبِ جنوں = عشقِ رسول میں گرویدگی

غربیوں = مغرب کے رہنے والے یعنی یورپ والے

فرنگیانہ = یورپ والی

دانشِ فرنگ = انگریزی تعلیم

افکار = فکر کی جمع ہے

ایاغ = شراب پینے کا پیالہ ہے

سکوں = چین، آرام ـــ فسوں = جادو

تخمین = اندازہ، اٹکل ـ ظن = گمان، وہم

باب = دروازہ، حصہ کتاب کا

ساحل = دریا کا کنارہ

ترساں = ڈرنے والا، ڈرتا ہوا

ندیم = ہم نشیں ۔ دوست، ساتھی

جدید = نیا ۔ قدیم = پرانا

سریر = تخت، بادشاہی

قلندر = وہ فقیر جو بے پرواہ ہو

نہنگ = گھڑیال ۔ ایک دریائی جانور

کرمِ کتابی = کتاب کا کیڑا

شورش = ہنگامہ

ابن = بیٹا ۔ اُم = ماں

دیکھیں مضمون: "اقبال کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات" کا ذیلی عنوان "اُم الکتاب" نمبر شمار (۱۷)

کم بصری = کم نظر آنے والا ۔ ہم کنار = ہم آغوش

خرد = عقل ۔ عفّت = پرہیزگاری

اسرارِ کتاب = قرآن کا راز

مضمون: نظم "الارض للہ" (قرآن کی روشنی میں)

سحاب = بادل

خوئے انقلاب = بدلنے کی فطرت

کاخ = عمارت، محل ۔ اُمرا = جمع امیر کی

شاہیں = باز، اقبال کا محبوب ترین پرندہ

فرسودہ = پرانا، بیکار

قُلِ العفو = دیکھیں مضمون "قُلِ العفو" اور سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۱۵

درخشندہ = چمکیلے

اُسلوب = طریق، طور

قبائل = قبیلہ کی جمع ہے

سلاسل = سلسلہ کی جمع ہے ۔ لوہے کی زنجیریں

بادِ سازگار = موافق ہو

دہ خدایا = صاحبِ قریہ ۔ جاگیردار

کنجشک = نام ایک چڑیا کا ۔ فرومایہ ۔ کمزور

مقامروں = جواریوں ۔ قمارخانہ = جوا کھیلنے کی جگہ

بتدریج = دھیرے دھیرے

سماوات = آسماں

فلزات = جمع فلز کی، چاندی، سونا، تانبا وغیرہ

بُتانِ شعوب = شعوب شعب کی جمع ہے معنی قبیلے بتانِ شعوب سے مطلب قبیلہ قبیلہ میں بٹ کر رہنے کی خواہش۔

مضمون: "قُلِ العفو" (اقبال کی نظم "صدیق رضہ" قرآن اور حدیث کی روشنیوں میں

اصحاب رضہ = صحابی کی جمع ہے

راہوار = رفتار گھوڑے کی

عیال = وہ رشتہ دار جن کا روٹی کپڑا اس شخص کے ذمہ ہو

اقارب = رشتہ دار لوگ

رفیقِ نبوّت = مُراد حضرت ابوبکرؓ سے ہے۔ اس رفاقت کا ذکر سورۃ التوبہ ۹ کی آیت ۴۰ میں وارد ہوا ہے

فرطِ طرب = خوشی

ایثار = دوسرے کا فائدہ اپنے فائدہ پر مقدّم کرنا

خویش = قرابت دار

ملّتِ بیضا = اُمّتِ مُسلمہ

بنائے = نیو عمارت کی

اُستوار = مضبوط، محکم

مردِ وفا سرشت = اس سے یہاں پر مُراد حضرت ابوبکرؓ ہیں

رَخت = اسباب، سامان

جنس = غلّہ ۔ اسپ = گھوڑا

قاطر = خچر ۔ حمار = گدھا

خیام = خیمہ

سرشت = خو، عادت، خصلت

مِلکِ یمین = مِلک بمعنی مال اسباب اور یمین بمعنی قوت، منزلت، مرتبہ یعنی اپنی حیثیت کے مطابق کُل مال و دولت

سُم = کھُر ۔ شُتر = اونٹ

تکوین = پیدا کرنا، وجود دینا

مضمون: علمِ خاص اور اللہ کی مصلحتیں

افسوں = جادو

کم ضَو = ضَو بمعنی روشنی

اسیر = مقیّد

مضمون: اقبالؔ کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات

دِلنواز = دل کو بھانے والی

شانِ خلیلؑ = (اس سے مراد حضرت ابراہیم خلیل اللہ) کے ایمان کی شان ہے

دوام = ہمیشہ

متاع = پونجی، اسباب سوداگری

سَطوَت = دبدبہ

رمز = راز

اہلِ دل = اس سے مُراد عاشقِ رسولؐ ہے

پیرِ مغاں = یہاں پر مراد رسول اللہ ہیں

صحرانورد = صحرا میں مارے پھرنا

دوش = گزری ہوئی رات

دمادم = پے درپے، دمبدم

رہین = وہ چیز جو گروہ رکھی ہوئی ہو

دشت = صحرا، بیاباں

آہو = ہرن ۔ خرام = نرم رفتار سے چلنا

برگ = سامان، پتّہ

بے سنگِ میل = بغیر یہ طے کیے ہوئے کہ جانا کہاں تک ہے

مزرع = کھیت ۔ عیاں = ظاہر

شعارِ آذری = آذر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تھا جو بت بنا کر بیچا کرتے تھے۔ یہاں پر مطلب کفر اور گمراہی ہے۔

سخنوری = یہاں پر شاعری مُراد ہے

فریب = دھوکہ ـــ سود و زیاں = نفع و نقصان

مُدام = ہمیشہ

رمزِ غریب = نادر راز

فقر = دنیا سے بے نیازی و بے رغبتی

خلیق = صاحبِ خُلق ـ مروّت والا

فردا = کل کا آنے والا دن

تگاپو = دوڑ دھوپ

دلیل = وجہ ثبوت

رہینِ خانہ = یہاں پر مُراد گھر میں بند رہنے والے ہیں

بانگِ رحیل = بانگ معنی آواز اور رحیل معنی کوچ
یعنی کوچ کرنے کی آواز

بے برگ = بغیر کسی سامانِ سفر کے

نمود = نکلنا ـــ اختر = ستارہ

سیماب = سیم معنی چاندی ـ چاندی کا پانی ـ پارہ

نمایاں = نمودار ہونے والا

بامِ گردوں = آسمان کی چھت

خلیلؑ = حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ

کشت = کھیتی ـــ نخیل = خُرما کا درخت

پیہم = لگاتار

فروغ = روشنی، آفتاب اور آگ کی تپش

خیرہ کرنا = آنکھیں چوندھیا جانا

فلاطوں = افلاطون یونانی فلسفی

ازل = شروع سے ـــ اہلِ خرد = عقل پر
بھروسہ کرنے والے

مُفسّر = تفسیر کرنے والا

زُنّار = جنیو ـ وہ دھاگہ جو ہندو لوگ گلے میں
رکھتے ہیں

ستیزہ کار = جنگ پر آمادہ

چراغِ مصطفویؐ = حق

کافرِ ہندی = اقبال نے خود کو کہا ہے

ثغور = جمع ثغر کی بمعنی سرحد

خودی غیر کی = یعنی بجائے ایمان کے کفر کو
دل میں بسا لیا ہے

ضربت = ضرب معنی مارنا

وزیری و محسود = یہ افغانستان کے مشہور قبیلوں
کا نام ہے

کُہسار = یہاں پر مُراد افغانستان ہے

الست = دیکھیں سورۃ الاعراف ۷ ـ آیت ۱۷۲

شاہینی = شاہیں چڑیا جیسی

دبستاں = مکتب، مدرسہ

سحرِ قدیم = پرانا جادو

یدِ بیضا = دستِ موسیٰؑ

تری = یہاں پر اقبال کی مخاطبت حضرت بلالؓ سے ہے

رستاخیز = قیامت

اسلاف = پچھلے بزرگوں

بام = گھر کی چھت - اوّل صبح

سکوت = خاموشی

سلسبیل = دیکھیں سورۃ الدھر ۷۶ - آیت ۱۸

زنجیریٔ کشتِ و نخیلی = اس سے مطلب دنیا سے لپٹے رہنا ہے۔

دوام = ہمیشہ ، ہمیشگی

مغربیاں = مغربی طرزِ فکر اور مغربی تعلیم

صاحبِ مازاغ = مُراد رسول اللہؐ ہے - دیکھیں سورۃ النجم ۵۳ - آیت ۱۷ -

اعراف = دیکھیں سورۃ الاعراف ۷ - آیت ۴۶ -

سدرہ = دیکھیں سورۃ النجم ۵۳ آیت ۱۴

خرد = عقل — زُنّاری = ایمان کی ضد

ازل = شروع — امروز = آج

شرار بولہبی = باطل

افتراق = فرق ڈال دینا ، جُدائی پیدا کرنا

حریم = گھر کے چاروں طرف کی دیوار - یہاں پر دل یا نفس مُراد ہے

ضربتِ کاری = یہاں صحیح نشانہ یا فیصلہ مقصود ہے

خلعت = لباس یا پوشاک جو بادشاہ سے کسی کو عطا ہو

مجاہدانہ = قرآن کی رو سے مال و جان سے جہاد کا جذبہ

لولاک = دیکھیں اسی مضمون کا نمبر شمار (۱۱)

روباہی = چالاکی ، روباہ کے معنی لومڑی

دانشِ حاضر = موجودہ تعلیم اور موجودہ طرزِ فکر

چوبِ کلیم = عصائے موسیٰؑ -

ناشکیبا = بے صبر

تری ظلمت = حضرت بلال حبشیؓ کا سیاہ رنگ

سُرعت = جلدی

یراق = فوج کا ہتھیار

مضمون : اقبال کے چند اشعار قرآن کی روشنی میں

مومیائی = دوا — مور = چیونٹی

سلیمانے = اشارہ حضرت سلیمانؑ کی طرف ہے یعنی بادشاہ

اُستوار = مضبوط - محکم

آفاق = جمع اُفق کی - آسماں کا کنارہ

سپہ = فوج — میر سپہ = سپہ سالار

گِل = مٹی

نبوّت = مُراد رسول اللہؐ ہیں

ضمیر = نفس

کتاب = یہاں پر مراد قرآن ہے

رومی = مولانا رومؒ جسے اقبال اپنا مرشد مانتے تھے

ماہِ کنعاں = مُراد حضرت یوسفؑ ہیں

آبستن = حاملہ

طیلساں = ایک قسم کا کپڑا

ریگ = ریت ، بالو

طُغیان = حد سے گزر جانا

طُغیانِ مشتاقی = یہاں مُراد خُدا اور اُس کے رسولؐ سے گرویدگی ہے

مورِ بے پر = مُراد مسلمان ہیں

گاز = قینچی

انفس = جمع نفس کی بمعنی روح و ذات

پائندہ = قائم

زِرہ = چلتہ — پنہ = پناہ

عالمِ جاوید = ہمیشہ رہنے کی جگہ بمعنی جنّت

ارمغان = تحفہ

نزول = نازل

نَے = نہیں — مہرہ = کوڑی

رقیب = پاسبان۔ وہ دو شخص جو ایک معشوق پر عاشق ہو اور ہر ایک دوسرے سے معشوق کی نگہبانی کرے۔ دونوں شخص ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔

سحاب = بادل

نخیل = خُرما کا درخت — برگ = پتہ

شکر خوابی = گہری نیند

مُشتاقی = ملنے کا شوق

پندار = غرور

مضمون: اقبال کے چند پند و نصائح

"بانگِ درا":

اُستوار = مضبوط

سیل = پانی جاری جو بہتا ہو

طور پر دریوزہ گری: یہ تلمیح ہے سورۃ الاعراف کے آیت ۱۴۳ کے اس ٹکڑے کی "قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ" کی

کلیسا = گرجا۔ عبادت خانہ یہود اور نصاریٰ وغیرہ کا

اسلاف = گزرے ہوئے لوگ۔ یہاں پر صحابہ کرامؓ تابعین و تبع تابعین مُراد ہیں

شُعلۂ سینائی = یہ تلمیح ہے سورۃ الاعراف کے کی آیت ۱۴۳ کے آخری فقروں کی

اندازِ کلیسائی = غیر اسلامی طرزِ فکر اور طرزِ عمل۔ یہ تضاد ہے "اندازِ مسلمانی" کا جسے اقبالؔ نے نظم "جوابِ شکوہ" کے بیسویں بند کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں استعمال کیا ہے۔ جس سے مُراد "اتباعِ رسولؐ" ہے۔

سکندر = اس سے مُراد سکندرِ اعظم ہے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں مقدونیہ (یونان) کا بادشاہ تھا اور جس نے ۳۲۶ ق۔م۔ میں ہندوستان پر حملہ کر کے مغرب کا کچھ حصہ پورس پر فتح حاصل کر کے کر لیا تھا

"لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد" = یہ تلمیح ہے سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۹۔ سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۴ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۰ کی

دارا = فارس (موجودہ ایران) کا بادشاہ جس سے سکندر اعظم نے جنگ کی اور فتح حاصل کی۔

شوکتِ دارائی = جاہ و عظمت مراد ہے

"بالِ جبریل"

امام = یہاں امام سے مُراد دینی پیشوا اور سیاسی رہنما سب ہیں

دلِ بیدار اور دلِ خوابیدہ = ان پر دیکھیں اسی مجموعہ کا مضمون "خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں = دیکھیں اسی مجموعہ کا مضمون "خدائے زندہ زندوں کا خُدا ہے"

یقیں = بمعنی ایمان

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ = یہ دونوں پرندے ضعیف اور عاجز ہیں اور ان میں کوئی باطنی خوبی نہیں۔ بلبل کے پاس آواز کے سوا اور طاؤس کے پاس رنگ کے سوا کچھ نہیں ان سے دشمن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا

قدم اٹھا = جدوجہد کر اور اپنی خودی کی تربیت کر کے اسکی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی = یعنی تو اشرف المخلوقات ہے اور ساری کائنات تیری خادم ہو مگر تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے۔

راہبی = دنیا ترک کر کے عیسائیوں کے پادری جیسا گوشہ نشین ہو جانا جو دنیا کی غلامی سے بہتر ہے

بے حضور = ضعیف الاعتقاد، ایمان کے رنگ کی کمی

نماز بے سرور = اس سے مُراد اللہ کے ساتھ تعلق کا درست نہ ہونا ہے۔

دلِ بینا = اشارہ ہے سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۴۶ کیطرف

رخت = سامانِ سفر

میرِ کارواں = رہنما خواہ وہ دینی ہوں یا سیاسی یا سماجی

فغفوری = بادشاہ چین کا قدیم زمانے میں

طاؤس = مور

من میں ڈوب کے = عاشقِ رسولؐ بنکر مقصدِ حیات کو جاننا

عشقِ بُتاں = غیر اللہ سے گرویدگی

نقشِ نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف = دنیا کی فانی اور لایعنی دلچسپیوں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو برباد نہ کر۔

مہ = ماہ کا مخفف ہے بمعنی چاند

پرویں = نام چند ستاروں کا جسکو عربی میں ثریا اور ہندی میں جُھمکہ کہتے ہیں

یہ بے سوادی، یہ کم نگاہی = یہ تمہاری جہالت اور اپنی حقیقت سے آشنا نہ ہونے اور کوتاہ بینی ہے

دُنیائے دوں = حقیر دُنیا

بادشاہی = دُنیا کی حکومت

خودی کو کر بلند اتنا = خودی کو خُدا کی مرضی میں فنا کرنا۔ اُس کی مرضی وہی ہو جائے جو اللہ کی ہے۔

خرد = عقل ــــ تسخیر = تابع کرنا

بے بصر = دیکھیں سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۴۶

نشیمن = گھونسلہ ــــ قصر = محل

خُدا بندے سے خود پوچھے = شاید اقبال کے ذہن میں سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۴۴ اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ اور سورۃ الاعراف ، کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۴ رہی ہوں۔

بیکرانہ = بے انتہا

خس وخاشاک = جنگل جھاڑ

حجازی = قرآنی

"ضربِ کلیم"

تیشہ = بسولہ یا لکڑی پھاڑنے کا ہتھیار

حرفِ آخر

اہلِ عزم و ہمت = یعنی دیندار مسلمان ــــ عزم = ارادہ ــــ لحد = قبر

الوندی = کنایہ ہے سربلندی سے کیونکہ الوند ایران میں واقع ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ضمیمہ نمبر ۲

"بانگِ درا" کی نظم "شکوہ"

(یہ نظم اقبال نے اپریل ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایت اسلام، لاہور کے سالانہ جلسہ میں سنائی تھی)

پہلا بند

کیوں زیاکار بنوں سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

دوسرا بند

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصّۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ، تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تیسرا بند

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن، پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے، اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح، جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو اس جمعیتِ خاطر پہ پریشانی تھی
ورنہ اُمّت ترے محبوب کی دیوانی تھی

چوتھا بند

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھّر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مُسلم نے کیا کام ترا؟

پانچواں بند

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے؟

چھٹا بند

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ساتواں بند

ہم جو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

آٹھواں بند

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقشِ توحید کا ہر اک دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

نواں بند

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا، اُس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوند کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیئے کُفّار کے لشکر کس نے؟
کِس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟
کِس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

دسواں بند

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟
اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کِس کی شمشیر، جہانگیر، جہاں دار ہوئی؟
کِس کی تکبیر سے دُنیا تری بیدار ہوئی؟
کِس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
مُنہ کے بل گر کے هُوَاللّٰهُ اَحَدْ کہتے تھے

گیارہواں بند

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بارھواں بند

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مئے توحید کو لے کے صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت تھے، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

تیرھواں بند

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

چودھواں بند

اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں — عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں — سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

پندرھواں بند

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے — ہے خوشی اُن کو، کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اُونٹوں کے حدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

سولہواں بند

یہ شکایت نہیں، ہیں اُن کے خزانے معمور نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بیچارے مُسلمان کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

سترہواں بند

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دُنیا نایاب؟ تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حُباب رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

اٹھارہواں بند

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دُنیا رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دُنیا
ہم تو رخصت ہوئے، اوروں نے سنبھالی دُنیا پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دُنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دُنیا میں ترا نام رہے
یہ بھی ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

انیسواں بند

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

بیسواں بند

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مُرسلؐ بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

اکیسواں بند

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا
بُت گری پیشہ کیا، بت شکنی کو چھوڑا
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

بائیسواں بند

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیٔ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مُضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

تیئسواں بند

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کیلئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیٔ رُخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں

چوبیسواں بند

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا گھر یہ اُجڑا ہے، کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

پچیسواں بند

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دُور ہنگامۂ گلزار سے ایک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ھُو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

چھبیسواں بند

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طُور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کیلئے

ستائیسواں بند

مشکلیں اُمّتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے ہند کے دَیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

اٹھائیسواں بند

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اُس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

انتیسواں بند

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتّیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اُس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اُس کی

تیسواں بند

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں

کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

اکتیسواں بند

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خُم ہے تو کیا، مَے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لَے تو حجازی ہے مری